اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

ستمبر 2016ء

قندیل ادب

مدیر : رانا عبدالرزاق خان

07886304637 & 02089449385

rana_razzaq@hotmail.com

www.qindeel-e-adub.com

ماہنامہ قندیل اَدب اِنٹرنیشنل لندن

مدیر:
رانا عبدالرزاق خان

شمارہ نمبر:45 ستمبر 2016ء

فہرست

نامے جو میرے نام آتے ہیں-ایک خط ایک تبصرہ	ادارہ	2
ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، جگر مرادآبادی، حضرت داغ دہلوی، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، محمد علی مضطرؔ عارفی، حفیظ فراز، جمیل الرحمن، طفیل عامر، منور احمد کنڈے، عبدالجلیل عباد، نورالجمیل نجمی، آدم چغتائی برمنگھم، محمد ہادی مونس، سوہن راہی، رشید قیصرانی، طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا، ارشاد عرشی ملک، شائق نصیر پوری، آصف محمود ڈار، شہزاد قیس، علی زریون بین، محمد قیصر شیراز، مظفر احمد مظفر، ساجد محمود رانا، عاصی صحرائی، عبدالقدیر کوکب، شہزاد قیس، عامر حسنی انڈونیشیا، ریحانہ توفیق، خالد عرفان،		
تحریک آزادی کشمیر کے اصل ہیرو	طاہر محمود احمد	14
الفریڈ نوبل اگر آج زندہ ہوتا	ناصر احمد شاہ	17
کرسی	ڈاکٹر طارق احمد مرزا آسٹریلیا	18
جنید عبدالقیوم شیخ کی تصنیف ''مسلم سائنس دانوں کی سائنسی خدمات	ڈاکٹر منورؔ احمد کنڈے	20
تعزیت	امجد مرزا امجد	21
عرض قیس	شہزاد قیس	22
ہم کب آزاد ہوں گے	محمد قیصر شیراز	23
ابن انشاءؔ ''اردو کی آخری کتاب'' سے اقتباس	وسیم الطاف	24
چہرے اور علمائے سُو	ابراہیم عابد	24
پارلیمنٹوں کے مذہبی فیصلے!	عاصی صحرائی	24
منافق معاشرہ-	حنیف سمانا	26
ملاحظاتِ کاشغری	نجم الثاقب کاشغری	26
گدھا وزیر	عامر سہیل	27
عبدالستار ایدھی صاحب سے چند ملاقاتیں	مکرم مبارک صدیقی صاحب	28
بخش لائلپوری کے متعلق	گوپی چند نارنگ	
حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے؟؟	ادارہ	29
اقتصادی راہداری کا منصوبہ	امجد مرزا امجد	31
کائنات اور ہم	ثقلین مبارک	31
ہائے یہ مسلمان	اعزاز لطیف خان	32
پاکستان کے علمائے سو کے کرتوت	شیراز وحید خان	32
جدوجہد آزادی کشمیر کے ایک گمنام بانی اور قائد	محمد حسین شاہد	33
مکرم قیصر محمود صاحب سابق ٹیسٹ کرکٹر حنیف محمد	لٹل ماسٹر	36
طفیل عامر کی کتاب پر تبصرہ ''دستک سے تھکے ہاتھ''	امجد مرزا امجدؔ	37

مجلس ادارت

زکریا ورک، امجد مرزا امجد، ایم اے حق بھارت، خواجہ عبدالمومن ناروے، آصف علی پرویز

نگرانِ اعلیٰ	:	خان بشیر احمد خان رفیق لندن
مدیر	:	رانا عبدالرزاق خاں
معاون مدیر	:	سید حسن خان
مدیر خصوصی	:	سہیل لون
ڈیزائنر	:	کرشن احمد
مینجنگ ڈائریکٹر	:	عاصی صحرائی
فوٹوگرافی	:	قاضی عبدالرشید، فضل عمر ڈوگر
آڈیو وڈیو	:	محمد اشرف خاکی

اراکین مشاورتی بورڈ

آدم چغتائی، منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یوکے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔

گزارش

ہم سب اہل علم احباب کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔ بلاتفریق اسے معیار کے مطابق شائع کیا جائے گا۔ جو دوست بھیجتے ہیں اُن کی قدر کی جاتی ہے۔ قندیل ادب تمام ممالک جہاں اسے قارئین موجود ہیں تقریباً دو لاکھ قارئین تک جاتا ہے اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم نادر اور نئی تخلیقات کو اس میگزین میں جگہ دیں۔ اور ہر بھیجنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، اور اس میگزین کا معیار بھی عوامی کریں۔ ہر ادیب و شاعر، نقاد، افسانہ نگار، اُردو کے خدمتگار کی عزت افزائی کریں۔ ہمیں کوئی صلہ مقصود نہیں۔ اگر آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس کا نام اور تعارف لکھ بھیجیں۔ اگر آپ کے پاس ادبی فن پارہ کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تا کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔ شکریہ۔

رانا عبدالرزاق خاں

نامے جو میرے نام آتے ہیں

آدم چغتائی برمنگھم سے رقم طراز ہیں:

رانا صاحب آداب! آپ کی شب و روز محنت کا اجر دینا تو مشکل بہت مشکل ہے۔مگر میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اسی طرح صحت مند رکھے ۔قندیل اَدب ویسے تو ایک میگزین ہے۔مگر عرصہ تقریباً چار سال سے یہ اُردو ادب کی بے مثال خدمت کر رہا ہے۔سُخن کی رُوحِ ایمانی کے جلوے جو قندیل اَدب میں کچھ عرصے سے نظر آرہے ہیں۔جس نے ایوانِ آگہی اور شعروادب کے کچھ اہم خوشنما پودوں کو سینچا ہے۔یہ رانا عبدالرزاق خان کا کمالِ ہنر ہے۔اس میں ہر قسم اور ہر درجہ کے شعراء کا کلام درج ہوتا ہے۔مذہب اور رنگ و نسل سے مبّرا،علاقائی اور ملکی تعصب سے پاک،صرف اُردو ادب کا پرچار کرنے والا یہ رسالہ دنیا کے دو صد ممالک میں چار لاکھ سے زائد قارئین تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ویب سائٹ کے ذریعہ بھی دستیاب ہے۔دیارِ مغرب میں رہ کر اُردو کی اس قدر خدمت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔اور پھر بے لوث اور بغیر کسی طمع اور لالچ کے مانندِ ماہتاب اپنی میٹھی اور نورانی کرنیں بکھیر رہا ہے۔

قارئین اس میں ہر برّاعظم اور ممالک سے اپنے مضامین اور اشعار بھیج کر اس کی حوصلہ افزائی میں مگن ہیں۔انڈیا کے ہر شہر میں یہ جاتا ہے۔ہر اُردو پڑھنے اور سننے والے تک اس کی رسائی ہے۔اس رسالے کی نہ کوئی فیس ہے اور نہ کوئی خرچ۔رانا صاحب خود ہی اس کا خرچ برداشت کرتے ہیں۔بعض مخیر حضرات ان کے خیر خواہ ہیں یا خداوند کریم اُن کا مددگار رہے۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

عبدالنور عابد کنیڈا سے لکھتے ہیں:

سابقہ شمارے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں میں برکت ڈالے۔آمین۔

قیصر شہزاد پاکستان سے رقم طراز ہیں۔آپ خوب لکھتے ہیں،قندیل ادب دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے،میری دعا ہے کہ اس کی روشنی ادبی دنیا کو خیرہ کر دے اور اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی لمبی عمر سے نوازے۔

ایک خط - ایک تبصرہ

(نجم الثاقب کاشغری)

جناب محترم ایڈیٹر صاحب

''قندیل ادب انٹرنیشنل''۔لندن

اگست کا شمارہ ایک دوست کی وساطت سے ملا۔سرورق پر بابائے پاکستان کی تصویر دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی لیکن پھر یہ خیال بھی آیا کہ قندیل ادب کا رسالہ تو ''انٹرنیشنل'' یعنی ایک عالمی اردو رسالہ ہونے کا داعی ہے۔اردو بولنے لکھنے والے لاکھوں افراد ''سرحد پار'' اُدھر بھی رہتے ہیں،ان کا یوم آزادی بھی تو اگست میں ہی منایا جاتا ہے!۔پھر بنگلہ دیش میں اردو بولنے والے بھی ابھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔اسی طرح میانمار بھی ہے(یعنی برما،جہاں ہمارے صاحبِ دیوان بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کا مزار ہے)وہاں کے روہنگیا باشندے اپنے بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھانا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

پس شاید مجھے کوئی ''غدار'' ہی سمجھے لیکن جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو اس کی دھوم محض پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بقول شاعر ؎ سارے جہاں میں ہے''۔2014 میں کراچی میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل اردو کانفرنس میں بھارت سے آئے ایک دانشور نے بجا طور پر کہا تھا کہ ''نجانے کیوں اردو کا نام سنتے ہی ہمارے ذہنوں میں پاکستان کا نام آجاتا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے''۔اسی منفی رویہ اور سوچ کے تدارک اور اصلاح کی خاطر احقر کی رائے میں قندیل ادب جیسے ''انٹرنیشنل'' اردو رسالے کے سرورق پر قائداعظم،ہلالی پرچم اور مینارِ پاکستان کے ساتھ بھارتی سپریم کورٹ کے اس پانچ رکنی بینچ کی فوٹو بھی شایع ہونی چاہئے جنہوں نے اردو کے حق میں ایک تاریخ ساز فیصلہ سنایا ہے!۔شاید قارئین میں سے کسی کو علم ہو کہ بھارتی سپریم کورٹ کے ایک پانچ رکنی بینچ نے 4 ستمبر 2014ء کو ریاست اُتر پردیش کی ایک اردو مخالف لسانی انتہا پسند تنظیم کی طرف سے دائر کی جانے والی ایک اپیل کو مسترد کرتے ہوئے فیصلہ دیا تھا کہ یوپی میں حکومت کی طرف سے دیا گیا اردو کا سرکاری درجہ برقرار رہے گا۔

(بحوالہ روزنامہ صحافت دہلی مورخہ 5 ستمبر 2014ء)

کاش کہ اپنے وطن عزیز پاکستان کی کسی اعلیٰ عدالت کو بھی یہ توفیق ملتی کہ وہ (کم از کم از خود ''سوموٹو'' نوٹس لے کر ہی) ایسا کوئی فرمان جاری کرتی جس کے تحت اردو کو پاکستان کی بھی سرکاری زبان کا درجہ عطا ہو جاتا۔کم از کم ایسا کوئی فیصلہ راقم کے علم میں نہیں۔

باقی جو آپ نے فرمایا کہ یہ ''محاسبہ'' اور تجدید ''مواعید'' کے دن ہیں تو اس بارہ میں مجھ ایسے کوتاہ ذہن اور کم عقل کے لئے مزید وضاحت بھی ضروری تھی کیوں کہ راقم اور اس کی ہم عمر نسل نے تو پاکستان نہیں بلکہ بنگلہ دیش بنتے دیکھا ہے اور میری طرح میرے کئی ہم عمر اب تک یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا سقوطِ ڈھاکہ سے ''دوقومی نظریہ'' کو کوئی نقصان پہنچا تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیسے؟۔

آپ کے توسط سے ایک سوال مضمون ''محمد علی جناح اور مسلڈن مسجد'' کے فاضل مصنف جناب انعام الحق صاحب تک بھی پہنچانا چاہتا ہوں ۔وہ یہ ہے کہ کیا درد صاحب نے میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے کہنے پر حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک حاصل کرنے کی تحریک چلانے کی درخواست کی تھی یا صرف مسلم اکثریتی شمال مغربی جنوبی صوبوں اور بنگال میں آباد مسلمانوں کے لئے؟ اگر یہ محض ایک علاقائی تحریک تھی تو ''دوقومی'' نظریہ کا اصل مطلب کیا تھا؟ جیسا کہ فاضل مصنف نے اس عزم کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ اس اہم تاریخی دور کے بارہ میں مزید تحقیق کر کے ''پوشیدہ حقائق'' قارئین تک پہنچائیں گے، مہربانی ہوگی اگر وہ اس نظریاتی نکتہ نظر سے بھی تاریخ پاکستان پر کچھ روشنی ڈالیں۔ جو حقیقت اب تک البتہ سامنے آچکی ہے وہ یہ ہے کہ آج ہندوستان اور بنگلہ دیش میں تو میرزا بشیر الدین محمود صاحب کی جماعت (احمدیہ) ایک مسلم فرقہ کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے لیکن پاکستان میں نہیں ۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے !۔ پاکستان میں اردو زبان کو سرکاری طور پر قومی زبان قرار دینے کا مطالبہ بھی باضابطہ طور پر میرزا صاحب موصوف نے ہی اپنے ایک پیغام میں کیا تھا جو 26 مارچ 1948 کو پنجاب یونیورسٹی (پاکستان) کی پہلی اردو کانفرنس کے افتتاحیہ اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ رہے نام اللہ کا۔

جواب

پیارے مکرم و محترم نجم الثاقب کاشغری صاحب

''قندیل ادب'' کے ماہ اگست کے ایشو پر آپ کا دلچسپ اور عالمانہ خط ملا۔ جس کے لئے ہم آپ کے بے حد مشکور اور ممنون ہیں۔ ''قندیل ادب کا مقصد اُردو زبان کی ترویج و اشاعت ہے یہ۔ مذہبی یا سیاسی رسالہ نہیں ہے۔ ہندو پاکستان سے باہر یورپین ممالک امریکہ و کنیڈا میں بسنے والے لاکھوں اُردو ادب کے شیدائی موجود ہیں۔ قندیل ادب انہیں ہر ماہ اُردو زبان کے معروف شعراء ادبا اور اہل علم کے رشحات قلم یا منظوم کلام پیش کر کے ان کی ادبی پیاس بجھانے میں بھرپور کوشش کرتا ہے۔ ہم جہاں پاکستانی ادیبوں اور شعراء کا کلام پیش کرتے ہیں وہاں ہر ماہ ہندوستانی اور دیگر ممالک کے شعراء اور ادیبوں کے رشحات قلم بھی رسالہ میں شامل کرتے ہیں۔ آپ اگر قندیلِ ادب کے دوسرے شمارے ملاحظہ فرمائیں تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ یہ رسالہ محض اُردو زبان کی ترویج اور اشاعت کے لئے بلا کسی جغرافیائی تخصیص اُردو زبان کی خدمت کرتا ہے۔

اگست کے شمارے کے سرورق پر جناب قائداعظم کی تصویر اس لئے درج کی گئی کہ دنیا بھر میں آباد لاکھوں قاری پاکستانی نژاد ہیں اور قدرتاً اُن کو بانی پاکستان کی محبت بہت عزیز ہے۔ یوں بھی اگر ہم بھارت بنگلہ دیش اور دنیا کے دیگر ممالک میں آباد اُردو زبان سے محبت کرنے والوں کے آبائی ممالک جہاں سے وہ ہجرت کر کے یورپ امریکہ جرمنی کینیڈا میں آباد ہیں تو یہ رسالہ سیاسی بن جائے گا۔

پاکستان میں اُردو زبان کو قومی زبان ہونے کا ارشاد قائداعظم نے آزادی کے بعد ڈھاکہ جا کر کیا تھا اب اگر پاکستان کی موجودہ حکومتیں ان کے اس حکم پر عمل پرا نہیں ہوتیں تو سوائے افسوس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ ایک وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مولانا عبدالرحیم درد صاحب نے جب حضرت مرزا بشیر الدین محمود کے حکم پر محمد علی جناح کو مسجد فضل لندن میں آکر تقریر کرنے کی دعوت دی تھی تو اُس وقت کسی کے تصور میں بھی مسلمانوں کی الگ مملکت بنانے اور پاکستان کا نام دیئے جانے کا خیال نہیں تھا۔ قائداعظم نے مسجد فضل کے احاطہ میں ''آزادی ہند کی بات کی تھی نہ کہ کسی اسلامی مملکت کے قیام کی۔ اور اس وقت قائداعظم نے دوقومی نظریہ بھی پیش نہیں فرمایا تھا۔ قائداعظم نے اپنے تقریر میں فرمایا تھا کہ ہمیں ہوم رُول کی صورت میں آزادی نہیں چاہیے بلکہ ہم مکمل آزادی چاہتے ہیں۔

اس جلسہ کی صدارت ایک انگریز ڈیوک فرما رہے تھے۔ انہوں نے قائداعظم کی مکمل آزادی کی بات کو پسند نہیں کیا تھا اور اپنے صدارتی ریمارکس میں قائداعظم کے مطالبہ آزادی کو رد کر دیا تھا۔ جس پر اجلاس میں موجود ہندوستانی طلباء نے قائداعظم کی تائید میں نعرہ بازی کی تھی۔ محترم نجم الثاقب صاحب جماعت احمدیہ تو روز اوّل سے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہی ہے۔ جس کا حوالہ آپ نے بھی دیا ہے۔ ہم ہر اُردو بولنے اور لکھنے والے کی قدر کرتے ہیں یہ اسلامی زبان نہیں اور نہ اس کا کسی خاص مذہب سے تعلق ہے۔ بے شک پاکستان کی قومی زبان ہے۔ مگر سب اردو بولنے والے اس کے وارثوں میں سے ہیں۔ انڈیا کورٹ کے فیصلے کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسی طرح سینکڑوں اُردو بولنے والوں ہندو سکھ و دیگر اقوام کے ہم قدردان ہیں۔ بہرکیف ہم آپ کے ممنون ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی رسالہ میں علمی اور ادبی مضامین بھجوا کر قارئین کے ازدیادِ علم کا باعث بنیں گے۔

خاکسار

عبدالرزاق خان

غـــزل

حمد

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

جہاں جہاں گئی نظر، وہاں وہاں مِلا ہے تُو
ہر ایک جا، ہر اک نگر، جو دیکھئے خدا ہے تُو
ہیں رنگ و نور چار سُو، ترا وجود کُو بکُو
چمن چمن، دمن دمن، جمالِ دل ربا ہے تُو
کہیں ہے تُو بلالؓ میں، کہیں کسی جمال میں
نہ ہو کسی کا گر کوئی، اسے بھی پالتا ہے تُو
یہ زندگی کی رونقیں ترے ہی دم سے گل فشاں
مرا نصیب ہے بلند، میرا آشنا ہے تُو
ہر ایک بحر و بر میں تُو، وجودِ خیر و شر میں تُو
ہر ایک سمت جلوہ گر جہاں میں اے خدا ہے تُو

غزل

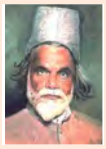

جگر مرادآبادی

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اُف کرکے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی
کیا دیکھیں گے ہم جلوہ محبوب کہ ہم سے
دیکھی نہ گئی دیکھنے والے کی نظر بھی
واعظ نہ ڈرا مجھ کو قیامت کی سحر سے
دیکھی ہے اُن آنکھوں نے قیامت کی سحر بھی
اُس دل کے تصدق جو محبت سے بھرا ہو
اُس درد کے صدقے جو اِدھر بھی ہو اُدھر بھی
ہے فیصلہ عشق جو منظور تو اُٹھیئے
اغیار بھی موجود ہیں حاضر ہے جگر بھی

کسی کو اچھے عمل سے دلی خوشی دینا
ہزار سجدے کرنے سے بہتر ہے۔
(شیخ سعدی)

حضرت داغ دہلوی

مرسلہ محمد قیصر شیراز

گلے مِلا ہے وہ مستِ شباب برسوں میں
ہُوا ہے دل کو سُرورِ شراب برسوں میں
خُدا کرے کہ مزا اِنتظار کا نہ مِٹے
مِرے سوال کا وہ دیں جواب برسوں میں
بچیں گے حضرتِ زاہد کہیں بغیر پیئے
ہمارے ہاتھ لگے ہیں جناب برسوں میں
حیا و شرم تمہاری گواہ ہے اِس کی
ہُوا ہے آج کوئی کامیاب برسوں میں
یہ ضعفِ دل ہی کی خُوبی ہے بلکہ ہے احساں
کبھی ہُوا تو ہُوا اضطراب برسوں میں
شبِ وصال اُسے کیوں نہ شرم آجائے
جب آئینہ سے بھی ٹوٹے حجاب برسوں میں
ہمارے بعد کچھ ایسا ہُوا مزاج اُن کا
کہ لطف روز ہے سب پر عتاب برسوں میں
نگاہِ مست سے اُس کی ہُوا یہ حال مِرا
کہ جیسے پی ہو کسی نے شراب برسوں میں
کہاں ہُوا ہے رُخِ یار قابلِ بوسہ
یہ دن دکھائے گا یہ آفتاب برسوں میں
نہ کیوں ہو ناز مجھے اپنے دل پہ اے ظالم
کیا ہے تُو نے جسے انتخاب برسوں میں
وہ بولے داغ کی صُورت کو ہم ترستے تھے
مِلا ہے آج یہ خانہ خراب برسوں میں

غزل

قتیل شفائی

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے
میں اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں سائے کو
بدن میرا ہی سہی، دوپہر نہ بھائے مجھے
برنگِ عود ملے گی اُسے مری خوشبو
وہ جب بھی چاہے بڑے شوق سے جلائے مجھے
میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے
وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا
جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے
میں اپنے دل سے نکالوں خیال کس کس کا
جو تو نہیں تو کوئی اور یاد آئے مجھے
زمانہ درد کے صحرا تک آج لے آیا
گزار کر تیری زُلفوں کے سائے سائے مجھے
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے
وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے
میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیلؔ
غمِ حیات سے کہہ دو خرید لائے مجھے

غزل

احمد ندیم قاسمی

انداز ہُو بہُو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا
اس رشتہ لطیف کے اسرار کیا کھلیں
وہ سامنے تھا اور تصوّر خدا کا تھا
ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا
دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

حسنِ اتفاق پہ لٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی وہ تقاضا وفا کا تھا
حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

غزل

محمد علی مضطرؔ عارفی

آنکھیں لے کر نکلے تھے آئینوں کے دلدادہ لوگ
اب تک گھوم رہے ہیں قریہ، قریہ، جادہ، جادہ لوگ
کل تک مرنے کے شائق تھے بھولے بھالے سادہ لوگ
ایک ذرا سی بات پہ ہیں اب جینے پر آمادہ لوگ
دُھلے دُھلائے، سیدھے سادے، اُجلے، صاف، کشادہ لوگ
اتنے ہی نایاب لگے ہیں جتنے بھی ہوں زیادہ لوگ
بات بات پر ٹوکنے والے، بوڑھے نیک ارادہ لوگ
پوتوں سے بھی بڑھ کر بے آواز ہوئے ہیں دادا لوگ
کیا جانے لفظوں کا بھاؤ، کیا بوجھیں لہجوں کے دام
تم شہری آواز کے تاجر، ہم دیہاتی سادہ لوگ
تم اک دوجے کی دیواریں اونچی کرتے رہتے ہو
ہم سے خواب میں آ کر مل جاتے ہیں دور اُفتادہ لوگ
راہ چلتوں کو تکتے تکتے بالآخر یہ ہوتا ہے
پتھر بن کر رہ جاتے ہیں راہوں میں ایستادہ لوگ
پلکوں سے تعمیر کئے تھے جن لوگوں نے تاج محل
اے تختِ طاؤس! بتا یہ کہاں گئے شہزادہ لوگ
اس سردی میں چلتے پھرتے رہنا ایک عبادت ہے
گرتے پڑتے منزل پا لیتے ہیں پیر پیادہ لوگ
عہدِ غم فراق میں مضطرؔ! آنا جانا چھوٹ گیا
اب فٹ پاتھ پہ باہم مل لیتے ہیں بلا ارادہ لوگ

غزل

اطہر حفیظ فراز

قصہ ابھی حجاب سے آگے نہیں بڑھا
میں آپ، وہ جناب سے آگے نہیں بڑھا
مدت ہوئی کتابِ محبت شروع کئے
لیکن میں پہلے باب سے آگے نہیں بڑھا
لمبی مسافتیں ہوں مگر اس سوار کا
پاؤں ابھی رکاب سے آگے نہیں بڑھا
طولِ کلام کے لئے میں نے کئے سوال
وہ مختصر جواب سے آگے نہیں بڑھا
لوگوں نے سنگ و خشت کے قلعے بنا لئے
اپنا محل تو خواب سے آگے نہیں بڑھا
وہ تیری چال ڈھال کے بارے میں کیا کہے
جو اپنے احتساب سے آگے نہیں بڑھا
رُخسار کی خبر نہیں آنکھیں تو خوب ہیں
دیدار ابھی نقاب سے آگے نہیں بڑھا
وہ لذّتِ گناہ سے محروم ہی رہا
جو خواہشِ ثواب سے آگے نہیں بڑھا

غزل

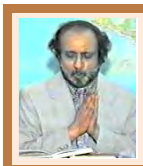

جمیل الرحمن

اُدھوری ہے یہ رُت پوری نہیں ہے
کہاں ہے گل اگر تتلی نہیں ہے
ہوا منڈلا رہی ہے گھونسلوں پر
پرندوں پر نظر اب اُس کی نہیں ہے
مجھے بھی دل نے تنہا کر دیا تھا
ترے بھی ساتھ اب کوئی نہیں ہے
جنوں اب کس طرف ہے عشق والو
کھلا ہے دشت اور وحشی نہیں ہے
سیاہ و زرد پانی کی ہیں لہریں
سمندر میں کوئی کشتی نہیں ہے
نہیں لکھی وہ دست غیب نے کیا
ہمیں لاحق جو مجبوری نہیں ہے
جمیلؔ اُس رات بھی میں کہہ رہا تھا
فصیلِ شہر پر کوئی نہیں ہے

غزل

طفیل عامر

جب تک بھید نہ کھل جائیں
زر کے بھاؤ تُل جائیں
! تم کو نہیں اندازہ کچھ
زہر جو بات سے گھل جائیں
گل سہرے کی لڑیوں میں
تربت پر بھی گل جائیں
موتی موتی رہتے ہیں
گو مٹی میں رُل جائیں
آپ کا دل گر کہتا ہے
آپ وہاں بالکل جائیں
ایسا کیا ہوتا ہے لوگ
جان دینے پر تل جائیں
سارے داغ طفیل عامرؔ
دھونے سے کب دُھل جائیں

غزل

منور احمد کنڈے

وطن پہ امتحاں کتنا کڑا ہے!
فلک جیسے سروں پہ گر پڑا ہے
ندی میں آج بھی طوفاں بڑا ہے
کچا اب بھی سوہنی کا گھڑا ہے
کسی کی یاد سے آتش بدن میں
مثالِ موم دل پگھلا پڑا ہے
گرا آنسو، بنا انمول گوہر
کسی دلہن کے جھومر میں جڑا ہے

مکاں جو ڈھا چکا ہے شہر بھر کے
مرے گھر کے وہ آگے اب کھڑا ہے
مجھے دیں داد میری شاعری پر
وفاؤں کا ہنر اس سے بڑھا ہے
گلشن تتلیوں کو ڈس رہے ہیں
منورؔ کس طرح کا دن چڑھا ہے!

غزل

عبدالجلیل عباد

دریچہ کھول کے دیکھا اُداس منظر تھا
پھر اپنے آپ میں جھانکا اُداس منظر تھا
سیاحت دیر تک کرتا رہا خیالوں کی
تمام سفر کا رستہ اُداس منظر تھا
جو ارد گرد دوڑائی نظر، تو کیا دیکھا
ہر ایک سمت ہی پھیلا اُداس منظر تھا
مایوس ہوکے سوگیا میں زمیں پہ ہی
جو خواب دیکھا تو وہ بھی اُداس منظر تھا
زمانے بعد میں گیا تھا اپنی گلیوں میں
آنکھوں کو ان کا بھی ڈستا اُداس منظر تھا
نجانے کب تک پھرتا رہا یونہی اُن میں
جو تھک کے بیٹھا تو دل کا اُداس منظر تھا
میں جس سے جاکے ملا اپنے جیسا ہی پایا
ہر ایک شخص کا چہرہ اُداس منظر تھا

غزل

آدم چغتائی برمنگھم

عشق میں ہم سے ہی وفا نہ ہوئی
زندگی درد سے جدا نہ ہوئی
چارہ گر شہر میں ہزاروں ہیں
میرے ہی درد کی دوا نہ ہوئی
لوگ کہتے ہیں مجھ کو دیوانہ
مجھ سے وارفتگی جُدا نہ ہوئی
تیرے قرباں اے وصالِ صنم
دلِ بیمار کو شفا نہ ہوئی
عمر جاوید مانگنے والو
زندگی کو کبھی بقا نہ ہوئی
اُن سے ملنے کی آرزو ہے ہمیں
جانے مقبول یہ دعا نہ ہوئی
ایسی جنت کو کیا کرے آدمؔ
جس میں شامل وہ خوش ادا نہ ہوئی

غزل

نورالجمیل نجمی

تمہارے نور سے سرشار مستانی ہوائیں ہیں
یہ کلیاں ہیں کہ شاخوں پہ تشکر کی دعائیں ہیں
تمہارے حسن کی ضو سے اُجالے جاگ جاتے ہیں
تمہاری اک تجلی سے اندھیرے بھاگ جاتے ہیں
تمہارے نام پہ رقصاں ہزاروں کہکشائیں ہیں
تمہارے پیار کی ادنیٰ جھلک ہم سب کی مائیں ہیں
تمہارا ذکر ایسا ہے دلوں کو چین دیتا ہے
تمہارا اسم اعظم رحمتیں دن رین دیتا ہے
خوشا وہ دل جو تیری راہ میں دھڑکن بچھاتا ہے
زہے قسمت وہ چشم نم کہ جس میں تو سماتا ہے

غزل

محمد ہادی مونس

محبت میں جب آپ کے ہو گئے
کسی اور دنیا میں ہم کھو گئے
رہِ عشق میں پھول بھی خار ہیں
بتاتے ہیں اس طرف جو گئے
ستائش کے قابل ہیں وہ لوگ جو
درِ آستاں تک پہنچ تو گئے
مقامِ جنوں سے مگر دور تھے
جہاں بھی تم اے خرد مندو گئے
ستاروں پہ جو ڈالتے تھے کمند
مسیحا کے وہ خاکِ پا ہوگئے
وہی سُرخرو ہونگے اگلے جہاں
گناہ اپنے دامن کے جو دھوگئے
غمِ وحشتِ دل فزوں تر ہوا
تلاشِ سکوں میں جدھر کو گئے

غزل

سوہن راہی

وہ داستاں جو کہ ہے تیری میری در بدری کی
وہ داستاں جو کہ ہے تیری میری بھی
وہ داستاں جو کھنکتی ہے میرے پاؤں میں
وہ داستاں جو مرے سانس میں ہے اُلجھی ہوئی
وہ داستاں ہے رگِ جان و دل میں سمٹی ہوئی
وہ داستاں جو کہ میرے لہو میں بہتی ہوئی
وہ داستاں جو مجھے رات دن یہ کہتی ہے
تمہارے جینے میں میرا کہیں شمار تو ہے
تمہارے جینے پر کچھ میرا اختیار تو ہے
یگوں سے ہر کوئی دُکھ درد پہنے جیتا رہا
وہ اپنی داستاں آنسو بناکے پیتا رہا

غزل

رشید قیصرانی

جس وقت تجھے ذہن میں تصویر کروں ہوں
لگتا ہے جہاں بھر کو میں تسخیر کروں ہوں
سورج کو کبھی چاند کو زنجیر کروں ہوں
یوں بھی تجھے ملنے کی تدبیر کروں ہوں
پوچھو ہو مرا کارِ سخن شہرِ سخن میں
بس یہ کہ تجھے لفظ میں تصویر کروں ہوں
ہر سانس میں ہوتی ہے ترے جسم کی خوشبو
جب ذکر ترا اے میرے دلگیر کروں ہوں
آ دیکھ قرینے میرے خطاطِ قلم کے
ہر سمت فضا میں تجھے تحریر کروں ہوں

غزل

طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا

کھینچ لائے ہو عبث غم کی فراوانی کو
دل ہی کافی تھا نہ کیا دل کی پریشانی کو

زاغ دیتا ہے اذاں بوم بنا ہے واعظ
اور کیا چاہیے اس شہر کی ویرانی کو

کاش لوٹ آئے مرے دیس کی ماؤں کا سکوں
کوکھ اب دے ہے جنم صرف پشیمانی کو

جو بھی سردار بنا،اس کو سردار کیا
چن لیا قوم نے اب جہل نگہبانی کو

آدمی لوحِ جہاں پہ تو نہیں حرفِ غلط
کیوں مٹاتا ہے فلک پیکرِ انسانی کو

کیا خبر کب ہو نیا کُوچ ، نیا ہجر و فراق
زندگی باندھ رکھو بے سروسامانی کو

اب ہیں دیوار نما دَر تو زباں بند دستک
اور چوکھٹ بھی نہ ترسے کسی پیشانی کو

غزل

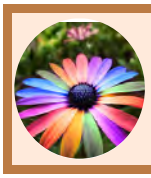

ارشاد عرشی ملک

اُس کی دھتکار پہ بھی دل نہ کراہا ،آہا
سُن کے دُشنام، اُسے ہم نے سراہا ،آہا

اُن کا تنہائی کے گنبد میں سسکنا دیکھو
جو سرِ بزم کیا کرتے ہیں آہا ،آہا

ترے نشتر کے میں قرباں ذرا سچ سچ کہو
زخم سیتا، کہ لگاتا ہے، جراحا، آہا

تیرے کوچے میں سدا بھیڑ رقیباں دیکھی
جانِ من دل ہے ترا یا کہ چوراہا، آہا

یہ جدائی تو مقدر تھی، وگر نہ ہم نے
کیسا کیسا، نہ ترا ساتھ نباہا، آہا

زخمِ دل میں دکھایا تو مہربان مرے
لائے تیزاب میں ڈوبا ہوا پھاہا ، آہا

لفظ کی اوٹ میں مفہوم چھپانے والے
بیچ دی تونے گواہی بھی گواہا، آہا

تو کسی اور کی قسمت کا تارا لیکن
جانتے بوجھتے ہوئے تجھے چاہا، آہا

آپ کی سسی و لیلیٰ تو کتابی ٹھہریں
اک حقیقت، مری مہ رُخ،مری ماہا، آہا

ہم تو لفظوں سے یونہی کھیل رہے تھے لیکن
اس غزل کا بھی نکل آیا مداحا ،آہا

ہم کو اچھی لگی عرشیؔ یہ ردیف آہا
اپنے لب پر بھی رہا دیر تک آہا ،آہا

اب تو قاری ہی غزل پڑھ کے بتائیں ہم کو
یہ مسرت کا تھا؟ یا دُکھ کا تھا آہا ،آہا

ماں

شائق نصیر پوری

خدا خوب سمجھتا ہے زخم سب کے رفو کرنا
فرمان نبی ؐ کے مطابق ہُو بہُو کرنا

طہارت ہر عبادت کے لئے جبکہ لازم ہے
خدمت جب بھی کرنا ماں کی باوضو کرنا

بات کوئی پوچھنی ہو یا جواب دینا ہو
آواز دھیمی رکھنا نرم لہجے سے گفتگو کرنا

ماں کے خلاف کسی کے کچھ کہنے سننے پر
کسی بھی طور نہ تصدیق کی خاطر جستجو کرنا

شائق کچھ بھی ہوجائے تم کو نصیحت ہے
اچھی بُری شکایت نہ ماں سے کبھو کرنا

غزل

آصف محمود ڈار

ردیف، قافیہ، بندِش، خیال، لفظ گری
وُہ حُور، زینہ اُترتے ہوئے سکھانے لگی

کتاب، باب، غزل، شعر، بیت، لفظ، حروف
خفیف رَقص سے دل پر اُبھارے مست پری

کلام، عَرُوض، تغزل، خیال، ذوق، جمال
بدن کے جام نے الفاظ کی صراحی بھری

سلیس، شستہ، مُرصع، نفیس، نرم، رواں
دَبا کے دانتوں میں آنچل، غزل اُٹھائی گئی

قصیدہ، شعر، مسدس، رُباعی، نظم، غزل
مہکتے ہونٹوں کی تفسیر ہے بھلی سی بھلی

مجاز، قید، معّمہ، شبیہ، استقبال
کسی سے آنکھ ملانے میں اَدبیات پڑھی

قرینہ، سَرقہ، اِشارہ، کِنایہ، رَمز، سوال
حیا سے جھکتی نگاہوں سے جھانکتے تھے سبھی

بیان، علمِ معانی، فصاحت، علمِ بلاغ
بیان کر نہیں سکتے کسی کی ایک ہنسی

قیاس، قید، تناسب، شبیہ، سجع، نظیر
کلی کو چوما تو جیسے کلی، کلی سے ملی

ترنم، عرض، مکرّر، سنایئے، اَرشاد
کسی نے ''سنیئے'' کہا، بزم جھوم جھوم گئی

حُضور، قبلہ، جناب، آپ، دیکھیئے، صاحب
کسی کی شان میں گویا لغت بنائی گئی

حریر، اَطلس و کمخواب، پنکھڑی، ریشم
کسی کے پھول سے تلووں سے شاہ مات سبھی

گلاب، عنبر و ریحان، موتیا، لوبان
کسی کی زُلفِ معّطر میں سب کی خوشبو ملی

کسی کے مرمّریں آئینے میں نمایاں ہیں
گھٹا، بہار، دَھنک، چاند، پھول، دیپ، کلی

کسی کا غمزہ شرابوں سے چُور قوسِ قزح
ادا، غرور، جوانی، سرُور، عِشوَہ گری

کسی کے شیریں لبوں سے اُدھار لیتے ہیں
مٹھاس، شہد، رُطب، چینی، قند، مصری ڈَلی

کسی کے نور کو چندھیا کے دیکھیں حیرت سے
چراغ، جگنو، شرر، آفتاب، ''پھول جھڑی''

کسی کو چلتا ہوا دیکھ لیں تو چلتے ہیں
غزال، مورنی، موجیں، نُجوم، اَبر، گھڑی

کسی کی مدھ بھری آنکھوں کے آگے کچھ بھی نہیں
تھکن، شراب، دوا، غم، خُمارِ نیم شبی
کسی کے ساتھ نہاتے ہیں تیز بارش میں
لباس، گجرے، اُفق، آنکھ، زُلف، ہونٹ، ہنسی
کسی کا بھیگا بدن، گُل کھلاتا ہے اکثر
گلاب، رانی، کنول، یاسمین، چمپا کلی
بشرطِ ''فال'' کسی خال پر میں واروں گا
چمن، پہاڑ، دَمن، دَشت، جھیل، خشکی، تری
یہ جام چھلکا کہ آنچل بہار کا ڈھلکا
شریر، شوشہ، شرارہ، شباب، شر، شوخی
کسی کی تُرش روئی کا سبب یہی تو نہیں؟
اچار، لیموں، اَنار، آم، ٹاٹری، اِملی
کسی کے حُسن کے بِن مانگے باج دیتے ہیں
وزیر، میر، سپاہی، فقیہ، ذوقِ شہی
نگاہیں چار ہُوئیں، وقت ہوش کھو بیٹھا
صدی، دَہائی، پرس، ،ماہ، روز، آج، ابھی
وہ غنچہ کیجا ہے چونکہ وَرائے فکروخیال!
پلک نہ جھپکیں تو دِکھلاؤں پتّی پتّی ابھی؟
سیاہ زُلف: گھٹا، جال، جادُو، جنگ، جلال
فُسوں،شباب، شکارن، شراب، رات گھنی
جبیں: چراغ، مقدر، کشادہ، دُھوپ، سَحَر
غُرور، قہر، تعجب، کمال، نور بھری
ظریف اَبرُو: غضب، غمزہ، غُصہ، غور، غزل
گھمنڈ، قوس، قضا، عشق، طنز، نیم سُخی
پلک: فسانہ، شرارت، حجاب، تیر، دعا
تمنا، نیند، اِشارہ، خمار، سخت تھکی
نظر: غزال، محبت، نقاب، جھیل، اَجل
سرُور، عشق، تقدس، فریب اَمرونہی
نفیس ناک: نزاکت، صراط، عدل، بہار
جمیل، سُتواں، معطر، لطیف، خوشبو رَچی
گلابی گال: شَفَق، سیب، سرخی، غازہ، کنول
طلسم، چاہ، بھنور، ناز، شرم، نرم گِری
دو لب: عقیق، گُہر، پنکھڑی، شراب کُہن
لذیز، نرم، ملائم، شریر، بھیگی کلی
نشیلی ٹھوڑی: تبسم، ترازو، چاہِ زقن
خمیدہ، خنداں، خجستہ، خمار، پتلی گلی
گلا: صراحی، نوا، گیت، سوز، آہ، اَثر
ترنگ، چیخ، ترنم، ترانہ، سُر کی لڑی
ہتھیلی: ریشمی، نازک، ملائی، نرم، لطیف
حسین، مرمریں، صندل، سفید، دودھ دُھلی
کمر: خیال، مٹکتی کلی، لچکتا شباب
کمان، ٹوٹتی اَنگڑائی، حشر، جان کنی
پری کے پاؤں: گلابی، گداز، رقص پرست
تڑپتی مچھلیاں، محرابِ لب، تھرکتی کلی
جناب! دیکھا سراپا گلابِ مرمر کا!
ابھی یہ شعر تھے، شعروں میں چاند اُترا کبھی؟
غزل حُضور بس اپنے تلک ہی رکھیے گا
وُہ روٹھ جائے گا مجھ سے جو اُس کی دُھوم مچی
جُھکا کے نظریں کوئی بولا التماسِ دُعا
اُٹھا کے ہاتھ وہ خیراتِ حسن دینے لگی
کشش سے حسن کی چندا میں اُٹھے مدوجزر
کسی کو سانس چڑھا سب کی سانس پھول گئی
جو اُس پہ بوند گری، اَبر کپکپا اُٹھا
اُس ایک لمحے میں کافی گھروں پہ بجلی گری
قیامت آگئی خوشبو کی، کلیاں چیخ پڑیں
گلاب بولا نہیں، غالباً وہ زُلف کھلی
طواف کرتی ہیں معصومیت یوں کم سِن کا
کہ قتل کردے عدالت میں بھی تو صاف بری!
بدن پر حاشیہ لکھنا، نگاہ پر تفسیر
مقلدین ہیں شوخی کے اَپنی شیخ کئی
تمام شہر میں سینہ بہ سینہ پھیل گئی
کسی کے بھیگے لبوں سے وَبائے تشنہ لبی
گلاب اور ایسا کہ تنہا بہار لے آئے
بہشت میں بھی گنجان شُوخ گُل کی کلی
کمالِ لیلیٰ تو دیکھو کہ ''صرف'' نام لیا
''پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی''
گلابی آنکھوں میں ایسے بھنور تھے مستی کے
شراب ڈوب کے اُن میں بہت حلال لگی
جسارت ''عکس'' پہ لب رکھنے کی نہیں کرتے
بہت ہُوا بھی تو پلکوں سے گدگدی کر دی
نجانے پہلی نظر کیوں حلال ہوتی ہے
کسی کے حُسن پہ پہلے نظر ہی مہنگی پڑی
چمن میں ''پھول نہ توڑیں'' لکھا تھا سو ہم نے
گلاب زادی کو پہنا دی تتلیوں کی لڑی
کسی کا زُلف کو لہرا کے چلنا، اُف توبہ!
شرابِ نابِ اَزل کے نشے میں مست پری
وہ بولتا ہے تو کانوں میں شہد گھولتا ہے
مریضِ قند پہ قدغن ہے اُس کو سننے کی
کلی کو چھوڑ کے نقشِ قدم پہ بیٹھ گئی
قلم ہلائے بنا تتلی نے غزل لکھ دی
صنم اور ایسا کہ بُت اس کے آگے جھک جائیں
دُعا دی اُس نے تو دو دیویوں کی گود بھری
عطائے حُسن تھی، قیس اِک جھلک میں شوخ غزل
کتاب لکھتا میں اُس پر مگر وہ پھر نہ ملی

غزل- شہزاد قیس

مرسلہ-قیصر شیراز

اَدائیں حشر جگائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
خیال حرف نہ پائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
بہشتی غنچوں میں گوندھا گیا صراحی بدن
گلاب خوشبو چرائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
قدم ، اِرم میں دَھرے ، خوش قدم تو حور و غلام
چراغ گھی کے جلائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
دِکھتا جسم ہے آتش پرستی کی دعوت
بدن سے شمع جلائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
غزال قسمیں ستاروں کی دے کے عرض کریں

حُضور! چل کے دِکھائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
چمن کو جائے تو دَس لاکھ نرگسی غنچے
زَمیں پہ پلکیں بچھائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
کڑکتی بجلیاں جب جسم بن کے رَقص کریں
تو مور سر کو ہلائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
حسین پریاں چلیں ساتھ کر کے ''سترہ'' سنگھار
اُسے نظر سے بچائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
یہ شوخ تتلیاں، بارِش میں اُس کو دیکھیں تو
اُکھاڑ پھینکیں قبائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
وُہ پنکھڑی پہ اَگر چلتے چلتے تھک جائے
تو پریاں پیر دَبائیں ، وُہ اِتنا دِلکش ہے
وُہ چاند عید کا اُترے جو دِل کے آنگن میں
ہم عید روز منائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
زَمیں پہ خِرمنِ جاں رَکھ کے ہوشمند کہیں
بس آپ بجلی گرائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
جنہوں نے سائے کا سایہ بھی خواب میں دیکھا
وُہ گھر کبھی نہ بسائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
اُداس غنچوں نے جاں کی اَمان پا کے کہا
یہ لب سے تتلی اُڑائیں ، وُہ اِتنا دِلکش ہے
کمر کو کس کے دوپٹے سے جب چڑھائے پینگ
دِلوں میں زَلزلے آئیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
وُہ آبشار میں بندِ قبا کو کھولے اَگر
تو جھرنے پیاس بجھائیں ، وُہ اِتنا دِلکش ہے
شریر مچھلیاں کافِر کی نقل میں دِن بھر
مچل مچل کے نہائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
حلال ہوتی ہے ''پہلی نظر'' تو حشر تلک
حرام ہو جو ہٹائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
جو کام سوچ رہے ہیں جناب دِل میں اَبھی
وُہ کام بھول ہی جائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
نہا کے جھیل سے نکلے تو رِند پانی میں
مہک شراب سی پائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
چرا کے عکس، حنا رَنگ ہاتھ کا قارُون
خزانے ڈھونڈنے جائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
کُنواری دِیویاں شمعیں جلا کے ہاتھوں پر
حیا کا رَقص دِکھائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
چنے گلاب تو لگتا ہے پھول مل جل کر
مہکتی فوج بنائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
غزال نقشِ قدم چوم چوم کر پوچھیں
کہاں سے سیکھی اَدائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
سرہانے میر کے ٹک فاتحہ کو گر وُہ جھکے
تو میر جاگ ہی جائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
حسین تتلیاں پھولوں کو طعنے دینے لگیں
کہا تھا ایسی قبائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
اَگر لفافے پہ لکھ دیں، ''ملے یہ ملکہ کو''
تو خط اُسی کو تھمائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
عقیق، لولو و مرجان، ہیرے ، لعلِ یمن
اُسی میں سب نظر آئیں، وُہ اتنا دِلکش ہے
گلاب، موتیا، چنبیلی، یاسمین، کنول
اُسے اَدا سے لُبھائیں، وُہ اتنا دِلکش ہے
مگن تھے مینہ کی دُعا میں سبھی کہ وُہ گزرا
بدل دیں سب کی دُعائیں ، وُہ اِتنا دِلکش ہے
شراب اور ایسی کہ جو ''دیکھے'' حشر تک مدہوش
نگاہ رِند جھکائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
نُجومی دیر تلک بے بسی سے دیکھیں ہاتھ
پھر اُس کو ہاتھ دِکھائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
بدل کے ننھے فرشتے کا بھیس جن بولا
مجھے بھی گود اُٹھائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
ہمیں تو اُس کی جھلک مست مور کرتی ہے
شراب اُسی کو پلائیں وُہ اِتنا دِلکش ہے
بہانے جھاڑو کے پلکوں سے چار سو پریاں
قدم کی خاک چرائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
وُہ چُومے خشک لبوں سے جو شبنمِ گُل کو
تو پھول پیاس بجھائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے بھیگے لب اُس کے
ہَوا میں شہد ملائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
مکین چاند کی بیعت کو جب بلاتے ہیں
دَھنک کی پالکی لائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
جفا پہ اُس کی فدا کر دُوں سوچے سمجھے بغیر
ہزاروں، لاکھوں وَفائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
سفید جسم جو لرزے ذِرا سا بارِش میں
تو اَبر کانپ سے جائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
جو اُس کو چومنا چاہیں، اَگر وُہ چومنے دے
تو چوم پھر بھی نہ پائیں ، وُہ اِتنا دِلکش ہے
ستارے توڑ کے لانے کی کیا ضرورت ہے
ستارے دوڑ کے آئیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
چمن میں اُس نے جہاں دونوں بازُو کھولے تھے
وَہاں کلیسا بنائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
ہم اُس کے چہرے سے نظریں ہٹا نہیں سکتے
گلے سے کیسے لگائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
وُہ جتنا جسم تھا، اُتنا غزل میں ڈھال لیا
طلسم کیسے دِکھائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
غلام بھیجتا، سر آنکھوں پر بٹھا لیتے
اُسے کہاں پہ بٹھائیں ، وُہ اِتنا دِلکش ہے
تمام آئینے حیرت میں غرق سوچتے ہیں
اُسے یہ کیسے بتائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
زَبان وَصف سے عاجز، حُروف مفلس تر
قلم گھسیٹ نہ پائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
طلسمِ حُسن ہے موجود لفظوں سے اَفضل
لغت جدید بنائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے
قسم ہے قیس تجھے توڑ دے یہیں پہ قلم
رَفیق مر ہی نہ جائیں، وُہ اِتنا دِلکش ہے

غزل

علی زریون بین

کیا بلا پھر گئی یہاں مولا
کسی آواز کی پھر کوئی سسکی
کسی بے جان کا کوئی نوحہ
کسی ایوان تک نہیں جانا؟؟؟
کیوں کسی کان تک نہیں جاتا؟؟
خفیہ آنکھیں مری ہوئی ہیں کہاں؟؟
کوئی قانون ہے؟؟؟؟
کوئی نہیں ہے یہاں؟؟
چاند تارا بجھایا جا رہا ہے
میرا چہرہ چرایا جا رہا ہے
چیختا بین کر رہا ہوں میں
اپنے اُدھڑے ہوئے گلابوں کی
پتیاں چن کے مر رہا ہوں میں
اک محبت کی نظم لکھنے سے
اک محبت کی نظم لکھنے تک
سانس لینے کا پل نہیں آتا
ہر طرف موت پھیل جاتی ہے
اور گھٹیا بیان آتا ہے
''ہم مذمت کریں گے دنیا کی''
ہم نبھائیں گے اپنے وعدوں کو
ہم بچائیں گے اپنے بچوں کو
اپنے وعدے تو تم نبھا دوگے
چار چھ ملز بھی لگا دوگے
اپنے بچے تو تم بچا لوگے
تف ہے اس ننگی بے حسی پہ علی
کسی بے جان کا کوئی نوحہ
کسی ایوان تک نہیں جاتا
بے گناہوں کے خون سے لکھا ہوا
شعر شیطان تک نہیں جاتا
یہ تو طے ہے مگر علی زریونؔ
دُکھ بھی رحمان تک نہیں جاتا؟؟؟

غزل

محمد قیصر شیراز

تیرے نام لکھا ہے اے عزیز جاں
عنفواں میں اے فگار جاں
تیری بے رخی پہ نثار جاں
ذرا التفات ارم بھی
کہ زیست بھرتی ہے آہ جاں
جلن کی ایسی کسک اٹھی
کہ چبھن نے دستک داغ دی
پھڑک رہی ہے رَگِ سکوں
زخود رَمیدہ اُچھال حیات ایاغ دی
تیرے کہن عشق مجاز نے
میرے جنوں کی دی تھیں ضمانتیں
کہاں گئے وہ حوصلے کہ گزر رہی ہیں قیامتیں
جفا گستر ، سونپ کہ مجھے جسم و جاں
اب کدھر ہیں وہ امانتیں
ٹیس ایسے اُٹھی ابھی
کہ آہ نغمہ سرا ہوئی
تار ساز اُلجھ گئے
سنجوگ نوک سنا ہوئی
مطربوں نے رَسن بہ گلو جو تان لی
حلق جاں پہ تبرّ ہوئی
نشید کشید کے واہموں سے قدح سبو
چھلک کہ جیسے اذاں ہوئی
صبا کی چپ کو ایسے زباں ملی
ہو میں قلقل شعلہ بیاں ہوئی
جادہ چاہ میں چیخ یونہی دبی رہی
سردر پن اشک رنگید کر حرف حرف چلا اٹھا
چاک گریاں پہ قسم شیراز
بزم سے خدا کو تھامے خدا اٹھا

غزل۔مظفر احمد مظفر

بطرزِ غلام ہمدانی مصحفی

جو لذت آشنا ئے دردِ ہجراں ہوتے جاتے ہیں
سرِ کو ئے تمنا وہ غزل خواں ہوتے جاتے ہیں
سفینہ ڈوب ہی جائے گا اب بحرِ تلاطم میں
حباب آسا حریفِ موجِ طوفاں ہوتے جاتے ہیں
وہی بنتے ہیں باعث دوستو بیتابیٔ دل کا
محبت میں جو نزدیکِ رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں
متاعِ دل جنہیں سونپی تھی میں نے راہِ اُلفت میں
تعجب ہے وہی غارت گرِ جاں ہوتے جاتے ہیں
چلے آؤ بہار آئی ہوئی ہے صحنِ گلشن میں
جگر کے داغ اب رشکِ گلستاں ہوتے جاتے ہیں
دبستانِ محبت میں اک ایسا دور آتا ہے
کہ اوراقِ کتابِ دل پریشاں ہوتے جاتے ہیں
اثر بعدِ فنا ہونے لگا ہے جذبۂ دل کا
''وہ مجھ کو دفن کر کے اب پشیماں ہوتے جاتے ہیں''
جنوں میں بھی مظفرؔ ہے ہمیں پاسِ ادب ہر دم !
بقدرِ ظرف محوِ حسنِ جاناں ہوتے جاتے ہیں

غزل

ساجد محمود رانا

دیکھ لی زندگی بسر کر کے
اب ذرّہ دیکھ لیں سفر کر کے
میں تو اک راز تھا محبت کا
تونے چھوڑا جیسے خبر کر کے
رات دن کیا تلاش کرتا ہوں
ساری چیزیں ہیں اِدھر اُدھر کر کے
ان ستاروں کو یاد کرتا ہوں
چُھپ گئے رات سحر کر کے
آج چھپتا رہا ہوں ساجدؔ
میری وحشت کو دَر بدر کر کے

غزل

عاصی صحرائی

ہم مثل شجر سب ہیں کھڑے ہوئے
ایستادہ تنہا، مگر سر ہیں جُڑے ہوئے
مثل دانۂ تسبیح باہم ملے ہوئے
کوئی ہلائے تو ہیں تنہا تنہا پڑے ہوئے
منزل ہے ایک، راہنما بھی ایک
مگر راستے ہیں جدا جدا لئے ہوئے
مد نظر ہے ہمہ وقت اللہ اور رسول
ہاتھ پہ کشکول غیر اللہ کے دھرے ہوئے
کوہِ اُمید وطمع دل میں چھپائے ہوئے
ہمہ وقت فکر فردا کی سوچ لئے ہوئے
ایک جسم ہے،ایک ہی مٹی ایک ہی خون
لالچ دہر میں، ہیں پسر و پدر باہم لڑے ہوئے

غزل

عبدالقدیر کوکب

لکھنا چاہوں لکھا نہیں جاتا
اذن ہو تو رُکا نہیں جاتا
فضل اتنا ہے اس دیوانے پر
گننا چاہوں تو گنا نہیں جاتا
اُس کی نظروں میں ہے کیا جادو
اثر سے اب بچا نہیں جاتا
فیض صدیوں سب ہی پاتے ہیں
ہاتھ خالی کسی کا نہیں جاتا
ہاتھ جب ہاتھ میں دیا اُس کے
خود کو خود کا کہا نہیں جاتا
چاہتا ہوں مدام دیکھوں اُسے
ہجر کا غم سہا نہیں جاتا
پیار اُس کا تو سمندر ہے
ڈوبنے سے رہا نہیں جاتا

مزاحیہ

شاعر نامعلوم

جس کو صدمہ شب تنہائی کی ایّام کا ہے
ایسے عاشق کے لئے نیٹ بڑے کام کا ہے
نیٹ فرہاد کو شیریں سے ملا دیتا ہے
عشق کو گوگل پہ بٹھا دیتا ہے
کام مکتوب کا ماؤس سے لیا جاتا ہے
آسوزوں کو بھی اپ لوڈ کیا جاتا ہے
ٹیکسٹ میں لوگ محبت کی خطا بھیجتے ہیں
گھر بتاتے نہیں آفس کا پتہ بھیجتے ہیں
عاشقوں کا یہ نیا دور نیا ٹائپ ہے
پہلے چلمن ہو کرتی تھی اب ا سکائپ ہے
عشق کہتے تھے جسے اک نیا سمجھوتا ہے
پہلے دل ملتے تھے اب نام کلک ہوتا ہے
دل کا پیغام جب ای میل سے مل جاتا ہے
میل ہر چوک پر فی میل سے ہو جاتا ہے
عشق کا نام فقط آہ فغاں تھا پہلے
ڈاک خانے میں یہ آرام کہاں تھا پہلے
آئی جب سے میل مجھے ہم سائے کی
اچھی لگتی ہے طوالت شب تنہائی کی
نیٹ پے لوگ جو نوے سے پلس ہو جاتے ہیں
بیٹھے رہتے ہیں وہ لوگ نہ ٹس سے مس ہوتے ہیں
فیس بک کوچہ جانہ سے ہے ملتی جلتی
ہر حسینہ یہاں مل جائے گی ہلتی جلتی
یہ موبائیل کیس عاشق نے بنایا ہوگا
اس کے محبوب نے ابا ؔ نے ستایا ہوگا
ٹیکسٹ عشق برقی کا اٹک جاتا ہے
طالب شوق تو سولی پی لٹک جاتا ہے
آن لائن تیرے عاشق کا یہی سہی
تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

غزل

شہزاد قیس

عقل سے ذات، ماورا اُس کی
کیا لکھے گا، قلم ثنا اُس کی
ذرّے ذرّے کا دائمی حاکم
آگ، مٹّی، پَون، گھٹا اُس کی
تحفے میں اُس کو کچھ بھی دے نہ سکا
''جو'' بھی سوچا تھا، تھی عطا اُس کی
ہم فقیروں کا کیا ہے دُنیا میں
حتیٰ کہ طاقتِ دُعا اُس کی!
''اللہ شافی'' کا معنی یہ ہے دوست!
ہر مرض میرا، ہر شفا اُس کی
سرفرازی کو، عمر بھر ترسا
سر جو چوکھٹ پہ نہ جھکا اُس کی
ایک پتھر نے، آدمی سے کہا
تُو بھی کچھ حمد گنگنا اُس کی
دھڑکنوں سے لطیف نغمہ تھا
دِل نے سنے نہ دی صدا اُس کی
حُور و جنت تو ''ضمنی'' بات تھی دوست
کاش تم مانگتے رِضا اُس کی
شرم کر کچھ گناہ کرنے میں
قیسؔ بخشش نہ آزما اُس کی

میرا پاکستان

عامر حسنی انڈونیشیا

ہے میرا پاکستان یہی
ہے پیارا پاکستان یہی
سرسبز پہاڑ بھی ہیں اس میں
گل رنگ بہار بھی ہے اس میں
ہر قوم کے لوگ بھی بستے ہیں
اور رنگ ہزار بھی ہیں اس میں

کچھ لوگ محبت عام کریں
ہر ایک کے مسکاں نام کریں
دہقان مشقت کرتے ہیں
اور ہر محنت پر مرتے ہیں
تم ہر سُو دیکھو کھیت یہاں
ہے محنت کی بھی ریت یہاں
کچھ ایسے کاروبار بھی ہیں
در اصل دیانت دار بھی ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی بستے ہیں
جو سب کچھ سچ سچ کہتے ہیں
جو میرے ملک کے فوجی ہیں
ہر دم بھاری ہیں دشمن پر
جس دم بھی قوم ہو مشکل میں
رکھتے ہیں جان ہتھیلی پر
ہم سب پر جان لٹاتے ہیں
خود اپنا خون بہاتے ہیں
لیکن شیطان بھی بستے ہیں
دشمن انسان بھی بستے ہیں
جو نفس کے نیچے ہوتے ہیں
تم ان کو چھوڑو یہ سوچو
خود کیسے ہو بس یہ سوچو
کچھ فرض تمہارا بھی تو ہے
تم بھی تو دھرتی ماں سے ہو
جو ہر سو پھیلے ہیں دشمن
پکڑو ان کو گر ماں سے ہو
یہ ملک بچانا ہے تم نے
دشمن کو بھگانا ہے تم نے
بس بیٹھے باتیں مت کرنا
اس ملک کی خاطر تم لڑنا
جس روز بھی تم سب جاگ گئے
تو سمجھو دشمن بھاگ گئے

مشکل ان کی پہچان نہیں
دشمن ہے جو انسان نہیں
ہر سو نفرت پھیلاتا ہے
ہر اک سے جو لڑواتا ہے
پیارے آقا ﷺ نے فرمایا
مسلم، مسلم کا بھائی ہے
پیغام ہے اس میں آقا ﷺ کا
محبوب ہو جیسے بھائی ہے
اس کے ہی نام پہ لوگوں نے
پھر کیوں نفرت پھیلائی ہے
تم ہردم امن کا باعث ہو
نفرت سے تمہیں نفرت ہو
پھر تم بھی رحمت پاؤ گے
مسکان محبت پاؤ گے
اپنی دھرتی کا عاشق بن
کیونکہ عاشق کمزور نہیں
عاشق وہ سب کر جاتا ہے
جو کرتا کوئی اور نہیں
ہر آن ہو تیرے دل میں بھی
محبوب ہے تجھ کو یہ دھرتی
ہر آن یہ میرے دل میں ہے
من اس دھرتی کا عاشق ہے

اے کاش کبھی تم جان سکو
میرا کہنا یوں مان سکو
پھر امن کی آشا ابھرے گی
ہر صورت دھرتی ابھرے گی

آدھی گواہی

ریحانہ توفیق

محبوبِ خدا خود جس سے کہے
جنت ہے ترے قدموں کے تلے
اے عقل کے اندھو سوچو تو
کیا اُس کی گواہی آدھی ہے؟
جس روز پکارے جاؤ گے
تم نام سے اپنی ماؤں کے
اُس روز اُسے بھی کہہ دینا
جا تیری گواہی آدھی ہے
یہ حدیثیں رحمتِ عالم کی
یہ موتی عقل و دانش کے
کیوں ان پہ یقیں ہے تم کو اگر
عائشہ کی گواہی آدھی ہے
قرآن کی رُوح نہ سمجھے تم
لفظوں کی غلامی کرتے رہے
اسلام تو دینِ مکمل ہے
بس عقل تمہاری آدھی ہے

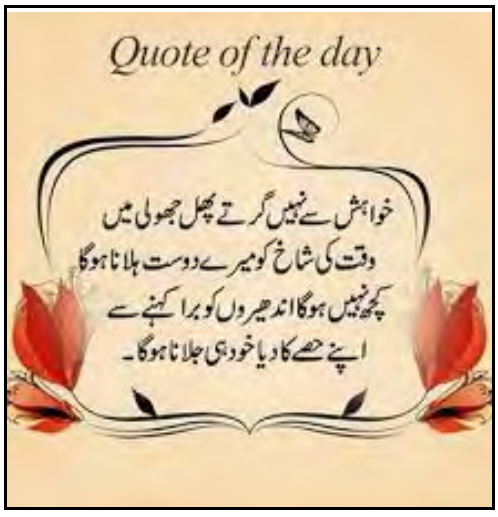

برائے فروخت۔ خالد عرفان

تعلیم میں، ادب میں، سیاست میں ، کھیل میں
ہر چیز بک رہی ہے ضرورت کی سیل میں
ووٹر بکے ہوئے ہیں منسٹر بکے ہوئے ہیں
ناقابل فروخت ہیں اکثر بکے ہوئے ہیں
چونکہ ہے اپنے ملک میں ہر نوجواں فری
دو لیڈروں کی سیل پے ایک حکمراں فری
جو بھی کھڑے ہیں قصر حکومت کے گیٹ پر
بکتے ہیں ضمیر فروشوں کے ریٹ پر
اب ریلوے کے دام نئے مرحلے میں ہیں
پی آئی اے کو بیچنے والے مزے میں ہیں
تعلیم کا نظام شرارت سے کم نہیں
علم و ہنر میں مال تجارت سے کم نہیں
اب نقل ہو رہی کتابوں کو کھول کر
اسناد بک رہی ہیں ترازوں میں تول کر
ٹیچر بکے، وکیل بکے، پیشوا بکے
میکش نہیں بکے ہیں یہاں پرسا بکے
ایک مولوی تو آم کی پیٹی پہ بک گیا
دوسرا رویت ہلال کمیٹی پہ بک گیا
استاد فن اصولِ تجارت پہ بک گیا
شاعر مشاعرے کی صدارت پہ بک گیا
اک شاعرہ تو ہونے لگی پھر کتاب سے
خاتون ایم این اے تھی وزارت پہ ٹک گئی
لوٹوں کے ساتھ آج صراحی بھی بک گئی
ڈاکو جو رہ گیا تو خزانہ پہ بک گیا
ووٹر غریب رات کھانے پہ بک گیا
کالم نگار حرف مکرر بھی بک گیا
استاف جب بکا تو ایڈیٹر بھی بک گیا
منشی فروغ عدل کی حالت پہ بک گیا
بھوکا تھا جو وکیل عدالت میں بک گیا
کچھ اور مل نہ پایا دوکان حیات سے
عورت فروخت ہوئی مزدوروں کے ہاتھ سے
تہذیب کی دوکان میں فی الفور کچھ نہیں
بے غیرتی خرید لو، گر کچھ اور نہیں
کچھ باغباں بہار چمن بیچنے لگے
جب کچھ نہیں ملا تو وطن بیچنے لگے
اپنا تو پورا ملک برائے فروخت ہے
غالب صریر کامہ نوائے فروخت ہے

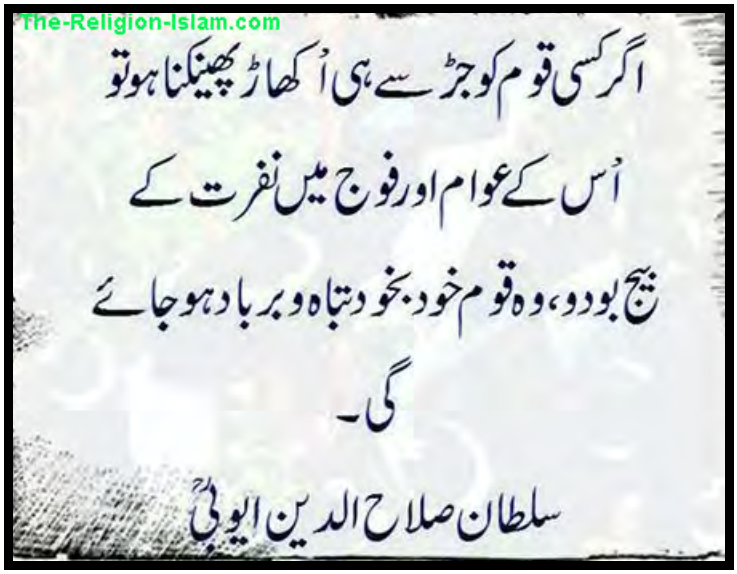

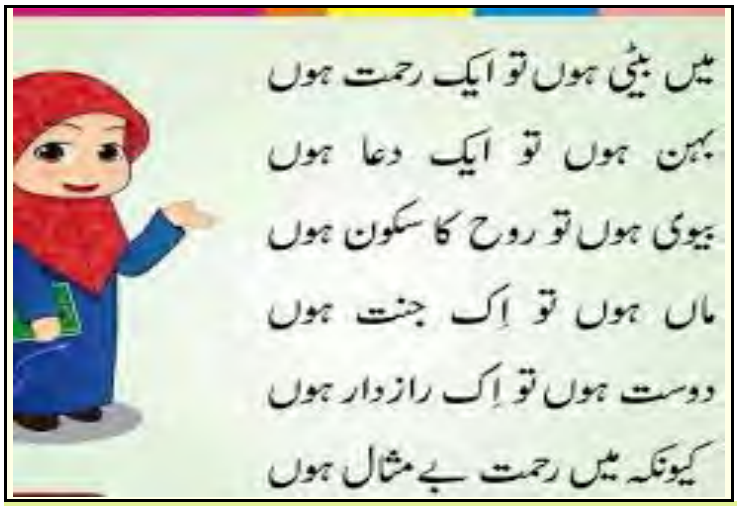

تحریک آزادی کشمیر کے اصل ہیرو

طاہر محمود احمد

کشمیر کی خوبصورت وادی جو قدرت کے دلکش مناظر کی وجہ سے ''جنت نظیر'' کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔اس وادی کے طول میں سے دریائے جہلم گزرتا ہے۔وادی کی زمین نہایت زرخیز ہے اور جابجا باغات سے مزّین نظر آتی ہے۔اس وادی کے ایک حصہ میں وہ مشہور علاقہ ہے جس میں زعفران پیدا ہوتا ہے۔وادی کے چاروں طرف پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو قدرتی جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے مگر اس میں دیہات اور آبادیوں کے آس پاس زراعت بھی ہوتی ہے۔قدرتی نالے اور چشمے کشمیر کی وادی اور پہاڑ کے حصہ ہر دو کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔مختصر یہ کہ کشمیر کی اصل وادی ایک دلکش سیر گاہ اور سیاحوں کا مرکز ہے۔جسے بجا طور پر برصغیر پاک و ہند کا سوئٹزرلینڈ کہنا بالکل مناسب ہوگا۔بعض لوگ اسے ایشیا کا وینس بھی کہتے ہیں اور سرینگر کو بغداد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔فرخی ،نظامی ،فیضی ،عرفی اور دوسرے نامور شاعروں کے کلام میں اس کی تعریف پائی جاتی ہے۔فرانسیسی سیاح وڈاکٹر گستاؤلی بان وادی کشمیر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے۔اس کے ایک طرف تو برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں اور دوسری طرف پہاڑوں کی دیواریں جہاں انسان کا قدم پہنچ نہیں سکتا۔ان دو موانع کے وسط میں نہایت خوشگوار آب و ہوا کا یہ ملک ہے جس کے کھیت سرسبز ہیں ،جھیلیں شفاف اور پرسکون ،گاؤں مکانات خوبصورت اور مندر اور قصروں کی دیواریں سفید سفید نظر آتی ہیں۔کشمیر کے وسط میں سری نگر جو کہ اس کا دارالسلطنت ہے۔دریا جہلم کے دونوں کناروں پر واقع ہے اور اس میں نہریں اس کثرت سے ہیں کہ اسے ہند کا وینس کہتے ہیں۔مکانات کی مسطح چھتوں پر ایک تہہ مٹی کی بچھائی گئی ہے۔جس میں سے ہری گھاس اور قسما قسم کے پھول کھلتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک معلق باغوں کا سلسلہ ہے اور جھیلوں کے اندر بھی تیرتے ہوئے باغ موجود ہیں۔کشمیر کا یہ خوبصورت اور دلفریب خطہ صوبہ کشمیر کا صرف ایک حصہ ہے اور ریاست میں صوبہ کشمیر کے علاوہ صوبہ جموں اور ملحقہ جاگیرات اور لداخ و گلگت کے اضلاع سرحدی بھی شامل ہیں۔

کشمیری مسلمانوں کی حالت زار

ریاست جموں و کشمیر برصغیر ہندو پاک کا ایک نہایت اہم علاقہ ہے۔آبادی کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔جو صدیوں یعنی تین چوتھائی سے کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ہندوستان میں مغلیہ دور کے زوال پر ریاست کشمیر کی حکومت سکھوں کے ہاتھ میں آ گئی۔اس دور میں مسلمانوں پر انتہائی مظالم روا رکھے گئے۔جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو گیا تب بھی انہوں نے کشمیری باشندوں کی بہتری اور ترقی کیلئے کوئی کام نہ کیا بلکہ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح صرف 75 لاکھ روپیہ کے بدلے راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ڈوگرہ راج میں مسلمانوں کی حالت مزید انحطاط پذیر ہوئی اور ان کی حالت جانوروں سے بدتر بنا دی گئی۔چنانچہ ایک مشہور انگریز کرنل ایڈیورنڈ اپنی کتاب میکنگ آف اے فرنٹیر (Making of A Farontier) میں لکھتے ہیں:

''تمام افسر اور سپاہی یا تو ڈوگرہ قوم سے ہیں یا دوسرے ہندوؤں سے کہ جنہیں کشمیریوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں۔سپاہی مزدوروں سے کتوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور انہیں اس طرح پیٹتے ہیں جیسے کوئی بوجھ اُٹھانے والے جانوروں کو پیٹتا ہے''۔

حضرت امام جماعت احمدیہ کی طرف سے مضامین لکھنے کا سلسلہ کشمیری مسلمانوں کے یہ ناگفتہ بہ حالات تھی جنہیں دیکھ کر حضرت امام جماعت احمدیہ بیقرار ہو گئے اور پھر ان کی راہنمائی اور مدد کے لئے لگاتار مضامین لکھے۔جناب فرماتے ہیں:

''میں متواتر کئی سال سے کشمیر میں جو مسلمانوں کی حالت ہو رہی ہے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں اور لمبے مطالعہ اور غور کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوا ہوں کہ جب تک مسلمان ہر قسم کی قربانی کرنے کیلئے تیار نہ ہوں گے یہ زرخیز خطہ جو نہ صرف زمین کے لحاظ سے زرخیز ہے بلکہ دماغی قابلیتوں کے لحاظ سے بھی حیرت انگیز ہے کبھی بھی مسلمانوں کی لئے فائدہ بخش تو کیا آرام دہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا''۔

کشمیری مسلمانوں کی ہمدردی اور بہبود کی خاطر لکھے گئے اپنے ان مضامین کے سلسلہ میں جناب نے ایک اور موقع پر فرمایا: ماہ مئی (1931ء) میں میں نے بعض مضامین ایسے پڑھے جن میں مسلمانان جموں پر سختی کرنے کا ذکر تھا۔میں کشمیر میں کئی دفعہ جا چکا ہوں۔وہاں کے مسلمانوں کی دردناک حالت کا مجھے علم تھا جس کی وجہ سے میرے دل میں زخم تھا اور یہ خواہش دل میں رہتی تھی کہ خدا تعالیٰ توفیق دے تو ان کی مدد کی جائے۔جب میں نے مسلمانان ریاست پر سختی کے حالات پڑھے تو وہ جوش اُبل پڑا اور میں مضامین لکھے۔'' (الفضل 10 جنوری 1932ء)

کشمیر کمیٹی کا قیام

حضرت امام جماعت احمدیہ نے نہ صرف یہ مضامین لکھے بلکہ جب کشمیری مسلمانوں پر سختی مزید بڑھی اور سرینگر میں ان پر گولیاں چلائی گئیں تو آپ ان کی حمایت میں عملی طور پر قدم اُٹھانے کیلئے بیقرار ہوگئے۔آپ نے ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کو مفصل خطوط لکھے۔کشمیریوں کی حمایت کیلئے ان کے ضمیر کو بیدار کیا اور انہیں مشورہ کیلئے شملہ بلایا۔اس اجلاس میں کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال صاحب کی تجویز اور سر فضل حسین صاحب اور دیگر سب لیڈران کی تائید اور پیہم اصرار پر حضرت امام جماعت احمدیہ نے کشمیر کمیٹی کا صدر بننا قبول فرمالیا اور کام شروع کر دیا۔اپنی خداداد ذہانت اور فراست سے کام لیکر حضور نے تھوڑے عرصہ میں ہی ریاست کے اندر اور باہر مسلمانوں میں ایک غیر معمولی بیداری پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں حصول حقوق اور آزادی کیلئے ہلچل مچ گئی۔ایک مضمون میں حضور نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:''جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر ہمیں کشمیر و جموں کے مسلمانوں کی آزادی کے سوال کو حل کرنا مطلوب ہے تو اس کا وقت اس سے بہتر اور نہیں ہوسکتا۔ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے نتیجہ میں قدرتی طور پر انگلستان اپنے قدم مضبوط کرنے کیلئے ریاستوں کو آئندہ بہت زیادہ آزادی دینے پر آمادہ ہے۔اگر اس وقت کے آنے سے پہلے جموں و کشمیر کے مسلمان آزاد نہ ہوگئے تو وہ بیرونی دباؤ جو جموں اور کشمیر ریاست پر آج ڈال سکتے ہیں کل نہیں ڈال سکیں گے''۔مسلمانوں کو موافق حالات سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حضرت امام جماعت احمدیہ اپنے ایک اور مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت غلامی کے خلاف سخت شور ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ کشمیر کی لاکھوں کی آبادی بلاقصور غلام بنا کر رکھی جائے۔آخر غلام اسی کو کہتے ہیں جسے روپیہ کے بدلے فروخت کر دیا جائے اور کیا یہ حق نہیں کہ کشمیر کو روپیہ کے بدلہ میں حکومت ہند نے فروخت کر دیا تھا۔پھر کیا ہمارا یہ مطالبہ درست نہیں کہ جبکہ انگریز عرب اور افریقہ کے غلاموں کو آزاد کرانیکی کوشش کر رہے ہیں وہ ان غلاموں کو بھی آزاد کرائیں جن کی غلامی کا سبب وہ خود ہوئے ہیں۔میں سمجھتا ہوں ہر ایک دیانتدار آدمی اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہوگا''۔

امام جماعت احمدیہ کے مضامین کا نہایت گہرا اثر

کشمیریوں کی آزادی کے بارہ میں حضور کے ان مضامین کی شان ایسی تھی کہ الفضل کے علاوہ لاہور کے بعض اخبار''انقلاب''وغیرہ بھی انہیں شائع کرتے رہے۔جس کے نتیجہ میں ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک لوگوں میں کشمیر کے مسلمانوں سے ہمدردی کا احساس پیدا ہوگیا اور وہ اپنے مظلوم بھائیوں کی ہر طرح امداد کرنے کیلئے تیار ہوگئے۔کشمیری مسلمانوں کیلئے حضور کی مساعی اتنی اعلیٰ اور کامیاب تھیں کہ کشمیری لیڈروں نے بھی اس کی برملا تعریف کی۔چنانچہ جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب نے اپنے ایک خط میں حضور کی خدمت میں لکھا:

''نہ میری زبان میں طاقت ہے اور نہ میرے قلم میں زور اور نہ میرے پاس وہ الفاظ ہیں جن میں جناب کا اور جناب کے بھیجے ہوئے کارکن مولانا دردصاحب اور سید زین العابدین صاحب وغیرہ کا شکریہ ادا کرسکوں۔یقیناً اس عظیم کام کا بدلہ جو کہ آنجناب نے ایک بیکس اور مظلوم قوم کی بہتری کیلئے کیا ہے صرف خدائے لایزال سے ہی مل سکتا ہے۔میری عاجزانہ دعا ہے کہ خداوند کریم آنجناب کو زیادہ سے زیادہ طاقت دیتا کہ آنحضور کا وجود مسعود بیکسوں کیلئے سہارا ہو''۔

کشمیریوں سے ہمدردی کا عزم صمیم

جناب امام جماعت احمدیہ کے مضامین اور مساعی کا کشمیریوں اور ان کے لیڈروں پر کتنا گہرا اثر تھا اور وہ حضور کے کس قدر ممنون احسان تھے۔کشمیری مسلمانوں کی آپ کے دل کیلئے حالت زار دیکھ کر ان کی مدد میں جو جوش اُٹھا وہ وقتی اور عارضی نہ تھا بلکہ زندگی بھر قائم رہا اور کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کے بعد بھی جناب امام جماعت احمدیہ اپنے طور پر جہاں اور جیسے ممکن ہوا اپنے عزم کے مطابق اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔آپ کا یہ عزم اتنا پختہ تھا کہ آپ نے جماعت احمدیہ کو بھی نصیحت کر دی کہ وہ حالات کے مطابق کامیابی تک اس کام کو جاری رکھے۔چنانچہ جناب فرماتے ہیں:''میں نے کشمیر کے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک کامیابی حاصل نہ ہوجائے خواہ سو سال لگیں ہماری جماعت ان کی مدد کرتی رہے گی۔یہ ہمارا کشمیر کے مسلمانوں سے وعدہ ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک حبشی غلام نیا یک قوم سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ فلاں فلاں رعایتیں تمہیں دی جائیں گی جب اسلامی فوج گئی تو اس قوم نے کہا ہم سے تو معاہدہ ہے۔فوج کے افسر اعلیٰ نے اس معاہدہ کو تسلیم کرنے میں لیت ولعل کی تو بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئی۔انہوں نے فرمایا مسلمان کی بات جھوٹی نہ ہونی چاہئے خواہ غلام ہی کی ہو۔مگر یہ غلام کا نہیں بلکہ جماعت کے امام کا وعدہ ہے۔پس ہماری جماعت کو مسلمانان کشمیر کی امداد جاری رکھنی چاہئے جب تک کہ ان کو اپنے حقوق حاصل نہ ہوجائیں خواہ اس کیلئے کتنا عرصہ لگے اور خواہ مالی اور خواہ کسی وقت جانی قربانیاں بھی کرنی پڑیں''۔ (الفضل 10 جنوری 1932ء)

بے غرضانہ خدمات کا اعتراف

تحریک آزادی کے دوران شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ صاحب (بعد میں وزیر اعظم کشمیر) نے حضرت امام جماعت احمدیہ صدر کمیٹی کی خدمت میں متعدد خطوط روانہ کئے۔جن میں سے کچھ محفوظ رہ گئے اور شائع کر دیئے گئے۔یہ خطوط حریت کشمیر کی

مستند تاریخ ہیں۔ان کے مطالعہ سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ تحریک کے اصل ہیرو کون تھے؟ اور ان کے مقاصد کتنے بے لوث اور بے غرضانہ تھے۔ 27 جنوری 1932ء کو سری نگر سے شیخ عبداللہ صاحب اور ان کے رُفقاء کی گرفتاری اور مفتی ضیاء الدین صاحب کے جبریہ اخراج کی خبریں قادیان پہنچیں تو حضرت امام جماعت احمدیہ نے بحیثیت صدر کشمیر کمیٹی ایک طرف مہاراجہ کشمیر کو اور دوسری طرف وائسرائے ہند کو تاریں دیں۔اس ضمن میں آپ کو طویل جدوجہد کرنا پڑی۔ بالآخر جب شیر کشمیر اور آپ کے 35 رفقاء 5 جون 1932ء کو رہا ہوئے تو شیر کشمیر نے حضور کی بے لوث خدمات کے متعلق حضور کی خدمت میں درج ذیل خط لکھا۔

’’مکرم و معظم حضرت میاں صاحب

السلام علیکم ورحمہ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔اس بے لوث اور بے غرضانہ کوشش اور جدوجہد کیلئے جو آپ نے کشمیر کے درماندہ مسلمانوں کے لئے کی۔ پھر آپ نے جس استقلال اور محنت سے مسئلہ کشمیر کو لیا اور میری غیر موجودگی میں جس قابلیت کے ساتھ ہمارے ملک کے سیاسی احساس کو قائم اور زندہ رکھا۔ مجھے امید رکھنی چاہئے کہ آپ نے جس ارادہ اور عزم کے ساتھ مسلمانان کشمیر کے حقوق کیلئے جدوجہد فرمائی ہے، آئندہ بھی اسے زیادہ کوشش اور توجہ سے جاری رکھیں گے۔ میں ہوں آپ کا تابعدار

شیخ محمد عبداللہ

(اقبال اور احمدیت باب 13 فصل 4)

تقسیم ہند کے وقت ریڈ کلف کا غلط فیصلہ

امام جماعت احمدیہ سوم حضرت مرزا ناصر احمد فرماتے ہیں:

1947ء میں جب پارٹیشن ہوئی اور ’’پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس وقت ریڈ کلف نے جو فیصلہ دیا تھا وہ ہندوستان کے حق میں تھا اور پاکستان کے وجود کو نقصان پہنچانے والا تھا۔ بظاہر تو اس نے ہر دو طرف کی باتیں سنیں لیکن ان دنوں میں بھی ہمیں یہ علم ہو رہا تھا کہ ہر دو کی باتیں سننے کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے اور فیصلہ گفتگو سے بھی قبل کر دیا گیا ہے۔اس غلط فیصلہ کا ایک حصہ یہ تھا کہ ضلع گورداسپور جو اس طرف سے کشمیر کا دروازہ ہے اور جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہ اس ایوارڈ میں ہندوستان کو دیدیا گیا۔ گورداسپور کا ضلع جیسا کہ تقسیم کا طریق کار مقرر ہوا تھا، پاکستان کے ساتھ شامل کیا جانا چاہئے تھا کیونکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ دوسرے وہ ایک طرف سے لاہور کے ضلع کے ساتھ ملحق تھا تو دوسری طرف سے سیالکوٹ کے ساتھ اور اس طرح کونٹیگوس (Contiguous) یعنی متصل ہونے کی جو شرط تھی، وہ بھی پوری ہوتی تھی لیکن گورداسپور کا ضلع ہندوستان کو دے دیا گیا اور اس طرح ہر وہ مضبوط بنیاد فراہم کر دی گئی جس سے کشمیریوں پر مزید ظلم وستم کا دور شروع ہو گیا۔ ایسا ظلم کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم ہو نہیں سکتا۔ گویا اُن کو زبردستی ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کی سکیم تیار کر لی گئی۔اس کے بعد ہندوستان نے عذرلنگ کی بنا پر وہاں اپنی فوجیں بھیجنی شروع کر دیں پھر یہ ایک مقدمہ کی شکل بن گئی اور پھر یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لے جایا گیا۔ وہاں کچھ قراردادیں منظور کی گئیں جن پر آج تک یہ بین الاقوامی تنظیم عمل نہیں کروا سکی‘‘۔ (خطبہ جمعہ فرمودہ 28 فروری 1975ء)

تقسیم ہند کے وقت پورے کشمیر کو آزاد کرانے کی خاطر حضرت امام جماعت احمدیہ نے رتن باغ لاہور میں کشمیری لیڈروں کی کانفرنس بلوائی اور کہا کہ یہ وقت کشمیریوں کی آزادی کا ہے۔ مفتی اعظم ضیاء الدین صاحب ضیاء کو صدر جمہوریہ کشمیر بننے کو کہا گیا مگر انہوں نے انکار کیا پھر ایک نوجوان قادری صاحب سے کہا گیا۔ انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ آخر میں قرعہ خواجہ غلام نبی صاحب گلکار انور (احمدی) کے نام پڑا۔گلکار انور نے 4 اکتوبر 1947ء سے بانی صدر ’’عارضی جمہوریہ حکومت کشمیر‘‘ کے نام سے ہری سنگھ مہاراجہ کشمیر کی معزولی کا اعلان کر دیا۔اس کے بعد 1985ء تک آزاد کشمیر میں بائیس حکومتیں بنیں۔ پہلی گورنمنٹ کا ذکر ریڈیو پاکستان پر بھی نشر ہوا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ اور دیگر اخبارات میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ بلقیس تاثیر اپنی انگریزی کتاب ’’کشمیر شیخ عبداللہ کا‘‘ میں ص 318 پر لکھتی ہیں:

The first Govt was formed on 4th Oct 1947 by Mr G.N .Gilkar Anwar.

یعنی پہلی آزاد کشمیر گورنمنٹ کا قیام خواجہ غلام نبی گلکار انور نے 14 اکتوبر 1947ء کو کیا۔ (ماخوذ)

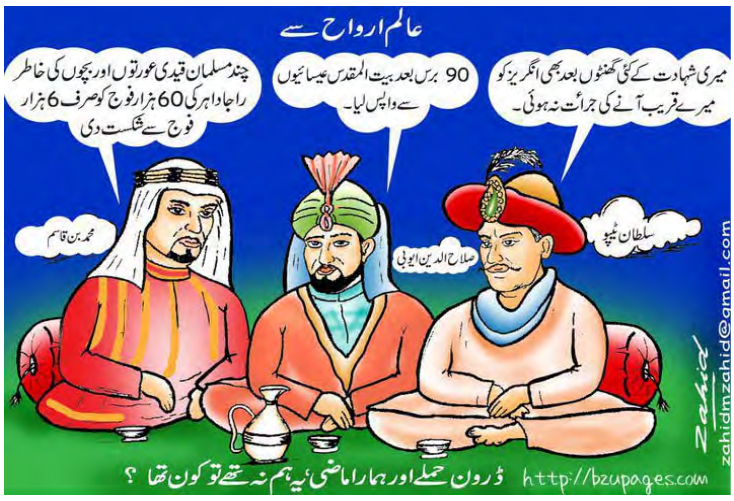

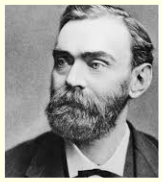

الفریڈ نوبل اگر آج زندہ ہوتا

ناصر احمد شاہ

الفریڈ نوبل کون تھا؟ ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولنے والا بچہ، ایک باہمت نوجوان جسے ساری عمر سر کا درد لاحق رہا مگر ایسا ہمت والا کہ عمر بھر سر پر پٹی باندھے اپنے کام میں مگن رہتا۔ سائنس اور تحقیق کے کام میں۔ اس نے بارود پر کام کیا۔ اس نے ڈائنامائیٹ ایجاد کرلیا۔ اس ایجاد کو اپنے نام سے پیٹنٹ کروانے کے بعد اس نے اس ڈائنامائنٹ سے ڈھیروں دولت کمائی۔ مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اس کی ساری دولت کا انتظام ایک ٹرسٹ کرے اور اس کی دولت سے سائنس اور تحقیق کے اعلیٰ کام کرنے والے سائنسدانوں کو انعام سے نوازا جائے تا کوئی سائنسدان فنڈز کی کمی کے باعث سائنس اور تحقیق کی دنیا کو خیر باد نہ کہہ دے۔ شاید اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کی زیادہ تر ایجادات عام طور پر انسانوں کی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہیں۔ بہرحال الفریڈ نوبل کی اس عظیم وصیت کا نتیجہ ہے کہ آج ہر سال فزکس، کیمسٹری، میڈیسن، ادب اور امن کے لئے اعلیٰ ترین کام کرنے والے افراد کو اس انعام سے نوازا جاتا ہے اور الفریڈ نوبل کے نام پر اس انعام کا نام نوبل پرائز تجویز کیا گیا ہے۔ یوں اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔ نوبل پرائز ایک گولڈ میڈل، ایک تعریفی سرٹیفکیٹ اور ایک خطیر رقم پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ انعام کسی ذاتی پسند اور ترجیحات کی بنیاد پر نہیں دیا جاتا۔ مختلف ذرائع سے پہلے ہر شعبہ میں ہر اچھا اور قابلِ ذکر کام انجام دینے والے افراد کی نامزدگیاں عمل میں آتی ہیں۔ مختلف کمیٹیاں ہر پہلو سے نامزد افراد کے کام کو جانچتی ہیں۔ پھر کسی بھی شعبہ میں اس سال کے لئے کسی ایک یا ایک سے زائد فرد یا افراد کو نوبل انعام کا حقدار قرار دیا جاتا ہے۔ مہذب دنیا جانتی ہے کہ نوبل پرائز کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ آج کی مہذب دنیا کا اہم ترین اعزاز ہے۔ علم دوست اقوام اسے اپنے ماتھے کا جھومر سمجھتی ہیں۔ مختلف کھیلوں کے ورلڈ کپ، چیمپئین شپس، اولمپکس، مقابلہ تن سازی، مقابلہ ہائے حسن اور آسکر ایوارڈز کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ سارے مل کر بھی ایک نوبل پرائز کا نعم البدل نہیں۔ نوبل پرائز کے سامنے ہر دوسرا دنیاوی انعام ہیچ ہے اس لئے کہ کسی بھی شعبہ میں کسی بھی ہستی کو دیا جانے والا نوبل پرائز اس کی شبانہ روز محنت کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اس امر کا اقرار بھی ہوتا ہے کہ اس کے کام سے بنی نوع انسان کا بھلا ہوگا۔ انسانیت کے دکھ درد کم ہوں گے۔ بھوکے انسانوں کے پیٹ بھرنے کا سامان ہو سکے گا، بے لباسوں کو تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا مل سکے گا، بنی نوع انسان کے ماتھے سے جنگ وجدل کا بدنما داغ دھل سکے گا، عورتوں، بچوں، مزدوروں اور اقلیتوں کو مساوی حقوق حاصل ہو سکیں گے۔ مصنف کا قلم ایسے ادبی شہ پارے تخلیق کرے گا جن سے نفرتیں کم ہوں گی اور محبتیں بڑھیں گی۔ بلاشبہ الفریڈ نوبل اگر آج زندہ ہوتا تو سویڈن کے شہر سٹاک ہوم میں ہر سال نوبل پرائز دیئے جانے کی پروقار تقریب اسے مزید زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی۔ اسے اپنی اس نیکی کا اجر یقیناً خدا کے حضور حاصل ہو رہا ہوگا۔

دو نوبل پرائز ہمارے پاس بھی ہیں۔ مگر ہمیں نوبل پرائز نہیں لینا۔ ہمیں تو کرکٹ کا ورلڈ کپ جیتنا ہے، ہمارے لئے ہاکی کا میدان زیادہ اہم ہے، ہمارے ہیروز اور ہیں، ہماری ترجیحات دیگر ہیں۔ ہماری گاڑیوں، ہوٹلوں، ہوسٹلوں اور نوجوانوں کی کتابوں اور کپڑوں پر بنے ہوئے نقش ونگار ہمارے ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ فی الحال نوبل پرائز ہماری ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ ہم آنکھیں بچھائے بیٹھیں ہیں مگر اپنے کرکٹرز کے لئے، ہمارے دل کے دروازے وا ہیں مگر بالی وڈ اور لالی وڈ کی چمک دمک کے لئے۔ ہم Red carpet welcome دیتے ہیں مگر گلوکاروں کو۔ نوبل پرائز ونرز کو دینے لئے ہمارے پاس جہالت اور تعصب کی دولت جو ہے۔ مجھے یقین ہے اگر آج الفریڈ نوبل زندہ ہوتا تو اپنے نوبل پرائز ونرز کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر وہ اپنے ایجاد کردہ ڈائنامائیٹ سے خودکشی کر لیتا۔ جھنگ کی سرزمین پر جنم لینے والے عبدالسلام نے جب گورنمنٹ کالج لاہور میں تحقیقی کام کی داغ بیل ڈالنے کی بات کی تو اسے فٹبال کلب کا صدر بنا دیا گیا۔ پھر اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب مجبوراً بیرونِ ملک چلے گئے۔ ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے۔ مغرب نے مشرق کے اس دھتکارے ہوئے ہیرے کو پہچانا اور اس کی قدر کی۔

پھر 1979 آ گیا، پاکستان کی تاریخ کا اہم سال۔ جب اسی جلاوطن پاکستانی کو نوبل پرائز دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ کیسا اعزاز تھا۔ ایک غریب اور ترقی پذیر قوم کی گود میں فزکس کا اعلیٰ ترین ایوارڈ۔ مغربی اقوام نے پنجاب کے اس سپوت کو اپنی شہریتیں دینے کی پیش کش کی مگر اس غیور بیٹے نے صرف ایک شناخت اپنے لئے پسند کی۔ اس کا پاکستانی ہونا۔ پھر سویڈن کے دارالحکومت سٹاک ہوم میں سویڈن کے بادشاہ اور دنیا بھر کے معززین کی موجودگی میں ایک پاکستانی جی ہاں ایک پاکستانی شلوار قمیص شیروانی کھسہ پہنے اور سر پر پگڑی (ہماری عزت کا نشان) سجائے فزکس کا اعلیٰ ترین انعام حاصل کرتا ہے۔ وہ لمحے آج بھی دل ودماغ کو ایک عجب سرور میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ پانچ پانیوں کی سرزمین کے اس عظیم بیٹے نے اس تقریب میں کیا کہا؟ کیسے کہا؟ آغاز کیسے کیا؟ میں اس پر کچھ نہیں کہتا۔ صاحبانِ نظر جانتے ہیں۔

میرا سوال یہاں یہ ہے کہ ہم نے من حیث القوم اس عظیم محب وطن کو فخر سے own کیوں نہیں کیا؟ دنیا اس کے علم اور کام کو سراہتی ہے اور ہم ہیں کہ آج بھی اسے کھلے دل سے پاکستان کا عظیم ترین سائنسدان تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا قصور کیا

تھا؟ وہ بدعنوان تھا؟ نہیں۔ وہ غدار تھا؟ نہیں۔ وہ کاہل اور کام چور تھا؟ نہیں۔ اس نے اقربا پروری کی تھی؟ نہیں۔ وہ قانون شکن تھا؟ نہیں۔ آخر اس کا قصور کیا تھا؟ اس کا ناقابلِ معافی قصور اس کے مذہبی اعتقادات تھے۔ بھلا سائنس اور حب الوطنی کا کسی کے مذہبی اعتقادات سے کیا لینا دینا۔ سائنس مذہب اور عقیدے کے اختلاف سے بالا ہے اور وطن اگر ماں ہے تو ماں سے محبت عقیدے کی محتاج تو نہیں ہوا کرتی۔ ہمیں تو اس کے قبر پر لگے کتبے تک سے شکایت رہی۔ میرے خیال میں مذہبی رواداری کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے قومی رویوں پر نظر ثانی کریں۔

دوسرا نوبل پرائز حال ہی میں وطنِ عزیز کی ایک عظیم بیٹی، صرف پختونوں کی نہیں بلکہ پنجابیوں، بلوچوں، سندھیوں، کشمیریوں غرض سب پاکستانیوں کی ملالہ کو دیا گیا۔ امن کا نوبل انعام Malala well done خوشی سے اچھلنے کو دل کرتا ہے۔ یہ چھوٹی سی عمر اور اتنا بڑا انعام۔ مجھے مبارک دیں کہ میرے وطن کی مٹی نے ایسی باہمت بیٹی کو جنم دیا ہے جس پر آج اقوامِ عالم کو ناز ہے۔ علم سے محبت ہے تو ملالہ سے پیار کرو۔ ملالہ میرے وطن میں تعلیم سب کے لئے کا جیتا جاگتا اعلان ہے۔ اس نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کام کیا۔ ہم نے اسے کیا دیا؟ گولیاں۔ وہ بھی باہر چلی گئی۔ فقیر کی گدڑی کا ایک اور لعل مغرب کی جھولی میں جا پڑا۔ وہاں غیر مسلموں نے اسے تعلیم کے لئے کام کرنے اور گولیاں کھانے پر دنیا کے اعلیٰ ترین ایوارڈ سے نواز دیا۔ کیا یہ ہمارا المیہ نہیں ہے کہ ہم اپنے قابلِ قدر لوگوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں۔ جب دنیا انہیں پھولوں کے ہار پہناتی ہے تو ہم تعصب کی عینک چڑھا لیتے ہیں۔ ملالہ کا کیا قصور ہے؟ کیا وہ بھی مختلف مذہبی عقائد رکھتی ہے؟ نہیں۔ پھر بھی زیرِ عتاب ہے۔ اے میرے وطن کے عظیم دانشورو، اے میرے نوجوانو، اے میرے مذہبی علم برادرو، اے میرے مہان سیاستدانو اور اے میرے بے عیب رہنماؤ! مجھے بتاؤ میرے وطن میں حقیقی تبدیلی کب آئے گی۔ میرٹ کا چلن کب ہوگا؟ عدل کا قیام کب ہوگا؟ میں اس وقت تک جینا چاہتا ہوں جب تک میری قوم وطن کے عبدالسلام اور ملالہ جیسے ہیروز کو بصد عزت و نیاز own نہیں کر لیتی۔ اگر میری زندگی میں ایسا نہ ہوا تو اے میری قوم میری یہ خواہش تم پر قرض رہے گی۔

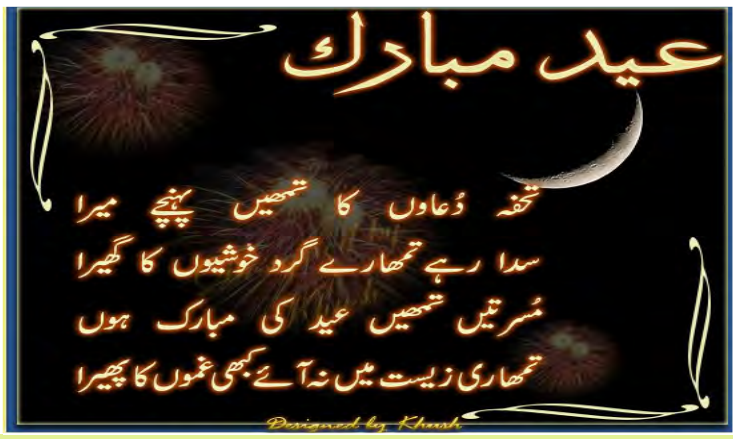

انشائیہ

کرسی

ڈاکٹر طارق احمد
مرزا۔ آسٹریلیا

کرسی ہر جگہ اور ہر قسم کی پائی جاتی ہے۔ چھوٹی، بڑی، اونچی، نیچی، گول، چوکور، نرم، سخت، سپرنگوں والی، فوم والی، گھومنے والی، نہ گھومنے والی، بند ہونے والی، نہ بند ہونے والی وغیرہ وغیرہ۔ کرسی عربی زبان کا لفظ ہے لیکن اردو محاوروں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کرسی کا احمق، کرسی نشین ہونا، کرسی دینا، کرسی کھینچ لینا، کرسیِ خاک، کرسی کی دوڑ وغیرہ۔ بعض کرسیوں کی ٹانگوں کے نیچے ہلال نما لکڑی لگی ہوتی ہے ایسی کرسیاں شرابی کرسیاں کہلاتی ہیں کیونکہ یہ ہر وقت کسی شرابی کے سر کی طرح آگے پیچھے جھوم رہی ہوتی ہیں۔ عموماً ان پر بزرگ اصحاب بیٹھے نظر آتے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ساری عمر زندگی کے دھکے کھا کھا کر انہیں آگے پیچھے ہوتے رہنے کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اس ''راکنگ چیئر'' پہ بیٹھ کر ''گاہے گاہے باز خواں ایں قصہِ پارینہ را'' گنگناتے ہوئے اپنی گردن، کمر اور روح کو عمر رفتہ میں کھائے دھکوں کی یاد تازہ کروا رہے ہوتے ہیں۔

بعض کرسیاں بازوؤں والی ہوتی ہیں، ان پہ بیٹھے ہوئے شخص کے لئے انگریزی میں ''اِن'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہوتی ہے جن کے بازو نہیں ہوتے، ان کے لئے ''آن'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ یعنی IN اور ON کسی بھی وقت اور کسی بھی موقعہ پر آپس میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض دفعہ وہ بھاری بھرکم خواتین وحضرات جو بھلے چنگے On the کرسی بیٹھے ہوتے ہیں اچانک کرسی کی سیٹ توڑتے ہوئے In the کرسی ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں کرسی سے باہر نکالنے کی خاطر کرسی کے فریم کو گرم کر کے یا کاٹ کر انہیں کرسی سے باہر نکالنا پڑتا ہے (اس فقرے کو سیاسی جملہ نہ سمجھا جائے) اسی طرح جب کوئی اور بھاری بھرکم صاحب (یا خاتون) کبھی In the کرسی بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں تو کرسی کی نرم و نازک بانہیں شرما کر ذرا ذرا پرے ہٹ جاتی ہیں اور جناب (یا محترمہ) اچھے خاصے In the کرسی ہوتے ہوتے On the کرسی ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ چند اور قسم کی کرسیاں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک کرسی تو وہ ہوتی ہے جس پر بیٹھنے والے کی یا تو گردن اکڑ جاتی ہے خواہ وہ کتنا غریب و لاچار ہی کیوں نہ ہو اور یا پھر وہ بیچارگی سے گردن جھکا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے خواہ وہ بادشاہ یا امیر ہی کیوں نہ ہو۔ میری مراد اس کرسی سے ہے جو حجام کی دکان میں پائی جاتی ہے۔ اگر اس پر بیٹھنے والے کی گردن اکڑی ہوئی نظر آ رہی ہو تو سمجھیں کہ بیچارے کی داڑھی پہ استرا پھر رہا ہے اور اگر گردن جھکی ہوئی ہے تو مطلب ہے کہ جناب کی حجامت ہو رہی ہے۔ اسی طرح ایک بجلی والی کرسی بھی ہوتی ہے جس پر بیٹھنے والے کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے عدالتی حکمنامہ کے

تحت قانونی طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔عدالت سے یاد آیا کہ ایک کرسی وہ بھی ہوتی ہے جو کمرہ عدالت یا گھر کے بزرگ ترین فرد کے کمرۂ خاص میں ہوتی ہے جس پر بیٹھا ہوا شخص فیصلہ صادر فرماتا رہتا ہے۔ایک اور قسم کرسی کی وہ ہوتی ہے جو جدید قسم کے بیوت الخلاء میں پڑی ہوتی ہے اس پر بیٹھا ہوا شخص (یا شخصیت) بھی کچھ نہ کچھ ضرور ''صادر'' فرما رہا ہوتا ہے۔بجلی والی کرسیاں بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو بٹن دبانے پر کمر پہ تھپکی دینا شروع کر دیتی ہیں خواہ بیٹھنے والے کی کارکردگی سرکاری محکمہ والی ہی کیوں نہ ہو۔مساج والی ان کرسیوں میں ایک بٹن ایسا بھی ہوتا ہے جو دب جائے تو نچلا دھڑ اوپر کو اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ان کے ساتھ یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ براہ کرم بٹن دبانے سے قبل پتلون پہننا نہ بھولیئے ورنہ کمپنی نتائج کی ذمہ دار نہ ہو گی۔غالباً ایسی کرسیاں بنانے والی کمپنی کو علم نہیں کہ برصغیر میں پتلون نہیں بلکہ دھوتی کا رواج ہے اور یہ کہ وہاں کرسی پر وہی لوگ قابض ہو سکتے ہیں جو شرافت کا لبادہ اُتار کر انسانیت کے جامہ سے پہلے ہی باہر ہو چکے ہوتے ہیں۔

یوں تو کرسی انسانوں کے بیٹھنے کے لئے بنائی جاتی ہے لیکن بعض دفعہ کتے، بندر، ریچھ اور طوطے بھی کرسی پر براجمان نظر آتے ہیں اور بعض پالتو کتے تو اس قدر نخریلے ہوتے ہیں کہ کرسی کے علاوہ انہیں کسی اور چیز پر بیٹھنا گوارا ہی نہیں ہوتا۔دراصل یہ کرسی ہے ہی ایسی چیز، کتے تو کیا بعض انسان تک اس پر بیٹھنے کی لذت سے ایک بار آشنا ہو جائیں تو اس پر اس بری طرح سے ریجھتے ہیں کہ پھر کرسی کو ان سے اور انہیں کرسی سے جدا کرنا جوئے شیر کھودنے سے بھی مشکل کام ہو جاتا ہے۔

ایک صاحب کو نئی نئی ترقی ملی تھی۔جب دفتر سے چھٹی ہوتی تو کرسی بھی اپنے ساتھ اٹھا کر گھر لے آتے۔وجہ پوچھی تو فرمانے لگے کہ بھئی پورے بیس سال کی تگ و دو کے بعد یہ کرسی ہاتھ آئی ہے، ڈرتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں کوئی دوسرا نہ اس پر قابض ہو جائے۔بات تو ان کی ٹھیک ہے مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایک خاص کرسی ہمیشہ کے لئے ایک خاص شخص کے لئے ہی مختص کر دی جائے۔مگر ہوتا یوں ہے کہ ایک آدمی تو ساری عمر کرسی کے مزے لوٹتا رہتا ہے اور دوسرا آدمی اسے دیکھ دیکھ کر جلتا بھنتا اور دل میں تشنہ امنگوں، ناکام آرزؤں، نامراد مسرتوں، مچلتے ارمانوں، ناتمام ارادوں اور کچلی امیدوں وغیرہ وغیرہ کی لاش کا ناگوار بوجھ سینے سے لگائے داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے عازم اقلیم عدم ہو جاتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ آج کل یہ ''دوسرا آدمی'' بھی خاصا ہوشیار ہو چکا ہے۔تفصیل اس کہانی کی پھر سہی لیکن ایک ادنیٰ مثال ہمارے ملک پاکستان کے ایک ایسے آمر کی ہے جس نے بیک وقت دو دو کرسیوں پہ بیٹھنے کا ریکارڈ قائم کر دیا۔چنانچہ پہلے خود ہی شیروانی زیب تن کر کے ایوان صدر میں پڑی سب سے بڑی کرسی پر بیٹھ کر حکمنامہ جاری کرتا کہ چیف آف آرمی سٹاف کے عہدہ میں توسیع کی جاتی ہے اور پھر فوجی وردی پہن کر جی ایچ کیو کی اعلیٰ ترین کرسی پہ بیٹھ کر کمال انکساری اور اطاعت کا نمونہ دکھاتے ہوئے اس صدارتی حکم نامہ کو وصول پا کر اس پر ''منظور ہے'' لکھ کر دستخط کر دیتا۔آخر کرتا بھی کیا، مجبوری تھی، حکم حاکم مرگ مفاجات!

۔نجانے کیوں کرسیوں پر بیٹھنے والے اور بیٹھ کر انہیں نہ چھوڑنے والے کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد اس ''آیت الکرسی'' کو کیوں بھول جاتے ہیں جسے کرسی پہ بیٹھنے سے قبل وہ پڑھ پڑھ کر دوسروں پر پھونکیں مارا کرتے ہیں؟۔

اور اب بارے کچھ ادب کے بھی بیاں ہو جائے۔قارئین آج کے جدید اردو ادب، صحافت، اردو میڈیا اور کرسی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔جن لوگوں کے پاس ادبی کرسی ہے ان کی ایک بے معنی، بے ہنگم اور بے ربط تحریر کو بھی اردو ادب کا ایک عظیم لاجواب اور بے مثال شاہکار قرار دے دیا جاتا ہے۔ہمارے دوست الٰہی بخش نے بتایا کہ انہوں نے اسی قسم کی ایک ''شاہکار'' تحریر پڑھ کر اسی طرز پہ ایک ''آزاد نظم'' لکھی اور ایک مشہور ادبی جریدے (قندیل ادب انٹرنیشنل نہیں!) کے ایڈیٹر صاحب (جو کسی رائٹر گلڈ کے صدر، متعدد فرمائشی ایوارڈ یافتہ وغیرہ ہیں) کی خدمت میں الٰہی بخش کے نام سے ہی بغرض اشاعت بھجوادی ۔جواب آیا کہ ''الٰہی بخشے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری عقل راولپنڈی کے راجہ بازار کے بس سٹاپ پر ویگن سے اترتے ہوئے کہیں گم ہو گئی ہے جو اپنا فضول وقت اس طرح سے ضائع کر رہے ہو۔ممکن ہو تو ''تلاش گمشدہ عقل'' کے اشتہارات کسی سے لکھوا کر لاری اڈہ یا تانگہ سٹینڈ میں کھڑی سواریوں میں بانٹا کرو، بصورت دیگر پاگل خانہ میں ایڈمشن کروالو'' خط پڑھ کر اسوقت تو خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے مگر جی ہی جی میں بدلہ لینے کی ٹھان لی اور ایک اور اعلیٰ پائے کے ادبی رسالے کی ایڈیٹر صاحبہ کو وہی نظم اس نوٹ کے ساتھ بھیج دی کہ ''پچھلے دنوں سیلاب کے ایام میں آبائی گھر کے تہہ خانہ میں سے سامان نکالتے ہوئے مجھے اپنے دادا جان مرحوم کے زنگ آلود ٹرنک میں ان کی ایک دیمک خوردہ پرانی ڈائری ملی جس میں برصغیر کے معروف ترقی پسند شاعر نون میم راشد صاحب کے اپنے ہاتھ سے لکھی ان کی ایک غیر مطبوعہ آزاد نظم لکھی ہوئی نظر آئی، میں چاہتا ہوں کہ جیتے جی یہ امانت ادب کے امینوں تک آپ کے توسط سے پہنچ جائے، والسلام۔نیازمند، آئی بی اندھیر نگروی''۔پھر ہوا یوں کہ نہ صرف وہی نظم ''ن۔م۔راشد'' کے نام سے چھپ گئی بلکہ اس پر بڑے بڑے کرسی نشین ادیبوں نے تعریفی، تجزیاتی، اور تحقیقی مقالے بھی لکھے۔لطف یہ کہ ان پہلے والے ایڈیٹر صاحب نے بھی اس نظم کو اپنے رسالے میں شائع کیا جو پہلے انہیں پاگل خانہ میں داخلہ لینے کا مشورہ دے رہے تھے۔اور اس نظم کی تشریح کرتے ہوئے ایسے ایسے نکات بیان کئے اور ایسے ایسے معارف و معانی و مطالب افشاء فرمائے کہ نظم لکھتے وقت ان کا علم ''شاعر'' یا اس کے فرشتوں کو بھی نہیں تھا!۔یہ ہے کرسی کا کمال، یعنی جن کی کرسی ہے انہی کا نام ہے اور جن کا نام ہے انہی کی کرسی!۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اردو میں ہمیں صرف ایک شاعر ایسا نظر آتا ہے جس نے کرسی پر شعر کہے ہیں، غالباً باقی سب شعرا کرسی کی دوڑ میں مصروف رہے ہیں۔ کسر نفسی آڑے آرہی ہے لہٰذا اس شاعر کا نام لینے سے معذور ہیں، تاہم کلام پیش خدمت ہے ؎

جو کچھ بھی وہ یہاں ہیں کرسی کے دم سے ہیں
'آقا' 'حضور' 'میڈم' کرسی کے دم سے ہیں
یہ دوڑ دھوپ، بھاگ دوڑ، کود پھاند سب
جتنی بھی ورزشیں ہیں کرسی کے دم سے ہیں
کرسی یہاں نہیں تھی تو کچھ بھی یہاں نہ تھا
اس بزم کی یہ رونقیں کرسی کے دم سے ہیں
کرسی جو جائے چھوٹ تو ہے زندگی فضول
اس زندگی کی راحتیں کرسی کے دم سے ہیں

قائداعظم ''ناٹ مسلم'' ہیں پاکستان اور خاکسار احرار

مظہر علی (احرار) اور مشرقی (احرار)
مسٹر جناح کی نجی زندگی پر بے بنیاد حملے

کوئٹہ 24 اپریل 1945ء مسٹر ایم جناح نے حسب ذیل ''پریس بیان'' جاری کیا ہے۔''...میری توجہ 17-18 تاریخ کے بعض ہندو اخبارات میں شائع ہونے والی مسٹر مظہر علی (احرار) اور مسٹر مشرقی (خاکسار) کی تقریر کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ یہ امر موجب تکلیف اور لائق افسوس ہے کہ ان لوگوں کی خسیس الحرکتی اور رذالت اتنی گہرائی تک جا پہنچی ہے کہ انہیں یہ ہدایت بھی ملی کہ وہ میرے متعلق اظہار کریں کہ میں مسلمان نہیں لیکن ان تقاریر میں میرے متعلق یا میری نجی زندگی کے خلاف لگائے گئے الزامات دجل وفریب کی پوٹلیاں ہیں..ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس ہمارے موقف یا لیگ کے مسلک اور پروگرام (جس کے لئے ہم جدو جہد جاری رکھیں ہوئے ہیں) کے خلاف کوئی اور دلیل نہیں اس لئے یہ لوگ اب کمینگی پر اتر آئے ہیں اور اس ذریعہ سے اب میرے بارے میں کذب پھیلا رہے ہیں۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کیا جائے مجھے یقین ہے کہ کوئی مسلمان جو ذرّہ بھر بھی فہم وادراک کا حامل ہو وہ میرے خلاف اس قسم کے گھٹیا اور جھوٹے الزامات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، جو ہندو پریس کے ذریعہ نشر کیا جارہا ہے۔ (ایسٹرن ٹائمز لاہور 25 ستمبر 1945ء)

جنید عبدالقیوم شیخ کی تصنیف
''مسلم سائنس دانوں کی سائنسی خدمات''
(مختصر تعارف)

تحریر: ڈاکٹر منور احمد کنڈے، ٹیلفورڈ، انگلینڈ

بلا شک یہ ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ ترین اعزازات پانے والے سائنسدان صاحبِ الہام یونیورسل لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں پر خداوندِ قدوس حصولِ نورِ علم کے راز کھولتا ہے، اور دنیا ان سے ہمیشہ مستفید ہوتی رہتی ہے۔ جناب جنید قیوم شیخ صاحب کی یہ کتاب انہیں لوگوں کے مختصر تذکروں سے بھرپور ہے۔ اسے قومی کونسل برائے فروغِ اردو کے تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کا انتساب مصنف نے اپنی والدہ مرحومہ ومغفورہ کے نام کیا ہے، اور تین خوبصورت دعائیہ اشعار بھی انتسابی صفحے پر اپنی والدہ ماجدہ کی یاد میں تحریر کئے ہیں جو مصنف کے اعلیٰ ظرف کی نشان دہی کررہے ہیں۔

تحریر وترتیب پر بہت محنت کی گئی ہے۔ شیخ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے زہرِ تعصب سے مبرہ قلبِ صمیم عطا فرمایا ہے۔ آپ کالج آف سائنس سولا پور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس ہیں۔

کتاب کا دیباچہ انگریزی زبان میں سولا پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر ڈاکٹر مالدار نے تحریر فرمایا ہے۔ اپنے تاثرات بیان کرنے والوں میں دیگر معتبر ومعظم افراد میں ڈاکٹر جمیل دفعدار صاحب پرنسپل انجنئرنگ کالج اور علمِ طبیعات کی ماہر سائنسدان ڈاکٹر عظمیٰ بانگی صاحبہ شامل ہیں۔ جن افراد نے کتاب کی اشاعت، تحریر وترتیب اور نظر ثانی میں مصنف کی کسی بھی رنگ میں مدد کی ہے اُن کے ساتھ

تعزیت کا جدید طریقہ - امجد۔ مرزا امجد

آئندہ کسی کے مرنے پر ہماری تعزیت، ممکنہ طور پر، کچھ اس طرح کی ہوا کرے گی حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا.....ہمیشہ آن لائن رہتا تھا، ہر ایک کی ریکویسٹ ایکسپٹ کرلیا کرتا تھا، اپنے کمنٹس کے ذریعہ کبھی کسی کو پریشان نہیں کیا، اس کی پوسٹیں بہت عمدہ اور جاندار ہوتی تھیں، بڑے کھلے دل کا مالک تھا، زندگی بھر کبھی کسی کو بلاک نہیں کیا، دوستوں کی سیلفیاں دل کھول کے لائیک کرتا تھا، امیروں کو شیئر اور غریبوں کو ٹیگ کیا کرتا تھا، ہر گروپ کا رکن تھا، جب موت آئی تب بھی فیس بک پر ہی بیٹھا تھا، اللہ رحم کرے، بہت اچھا آدمی تھا۔

مصنف نے خصوصی طور پر اظہارِ تشکر کیا ہے۔مسلم سائنسدانوں کے کارناموں اور خدمتِ خلق پر مشتمل بانوے صفحات کی اس مختصر سی کتاب بارہ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے تین ابواب مکینیکل ،نقل وحمل اور گن پاؤڈر ٹیکنالوجی پر مشتمل ہیں۔ان ابواب کے بعد طبیعات (Physics)، کیمیا (Chemistry)، طب (Medicine)، نباتات (Botany)،حیوانات (Zoology)، ریاضی (Mathematics) ، بصریات (Optics) ، ہیئت و فلکیات (Astronomy)،اور جغرافیہ (Geography) کے ابواب شامل کئے گئے ہیں۔

علمِ کیمیا کے عظیم ترین سائنسدان جابر بن حیان کے ایک ہزار دوسو برس قبل ۸۵۱ء میں انتقال کے بعد کئی مسلم سائنسدانوں نے دنیا کو مسلسل اپنی خدمات سے نوازا۔تقی الدین معروف (سن وفات ۱۵۸۵ء) تک ہر صدی میں دو چار مسلم سائنسدان سامنے آتے رہے اور دنیا کو ضیائے علم سے منور کرتے رہے۔مگر اس کے بعد میں آنے والی دوصدیوں میں کوئی قابلِ ذکر مسلم سائنسدان میسور کے سلطان ٹیپو تک نہیں گذرا۔سلطان نے آہنی راکٹ سلنڈر اور کیس تیار کئے جو انگریزوں کے راکٹ سے کہیں زیادہ بہتر تھے جنہیں انگریزوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔مصنف نے سلطان ٹیپو کو بھی سائینسی مشاہیر میں شامل کیا ہے۔

سلطان ٹیپو (وفات ۱۷۹۹ء) کے دوصدیوں بعد شہر جھنگ صوبہ پنجاب کے پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالسلام کو علومِ طبیعیات (پارٹیکل فزکس) میں تحقیق پر ۱۹۷۹ء میں نوبیل پرائز حاصل ہوا۔انہوں نے الیکٹروتھیوری کے نظریہ کو پیش کیا۔ان کا دعویٰ تھا کہ اس تھیوری کی طرف قرآنِ کریم کے مطالعہ نے ان کی رہنمائی کی تھی۔

ڈاکٹر عبدالسلام (وفات ۱۹۹۶ء) کے ہمعصر معروف ایرو ناٹیکل انجنیئر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام (وفات ۲۰۱۵ء) تھے جو بھارتی ایٹمی پروگرام کے خالق بھی تھے۔ڈاکٹر عبدالکلام ہندوستان کے ہیرو اور محترم ترین سائنسدان تھے جن کو مصنف نے اسی حیثیت سے شاملِ کتاب کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر عبدالکلام کے ہمعصر کیمسٹری میں نوبیل پرائز ہولڈر ڈاکٹر احمد حسن ذویل ہیں۔وہ اللہ کے فضل سے حیات ہیں۔ان کی عمر ستر برس ہے۔مصر کے شہری ہیں۔ان کو پاکستانی ڈاکٹر عبدالسلام کے بیس برس بعد ۱۹۹۹ء میں سائنس کے میدان میں نوبیل پرائز حاصل ہوا۔لیکن احمد ذویل کے بعد سترہ برسوں میں سائنس کے میدان میں کسی مسلمان کو تا حال یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ڈاکٹر ذویل نے دنیا کا تیز ترین کیمرہ تیار کیا تھا جو کیمیائی ردِعمل کے دوران مولی کیولز کے اندر ایٹم (atom) کو بھی دیکھ سکتا ہے۔

اس کتاب میں جابر بن حیان سے لے کر آج تک کے پچاس شہرہ آفاق باشعور مسلم محققین کا ذکرِ خیر ہے جن کو سائنسدانی میں انسانیت کی خدمت کے اللہ تعالیٰ نے مواقع فراہم کئے اور دنیا بھر میں ان کی پزیرائی ہوئی اور مستقبل کے سائنسدانوں نے ان سے استفادہ کیا اور اس طرح نئی نئی ایجادات ہوتی رہیں۔

مصنف کا اصل مقصد اہلِ اسلام کو یاد دلانا اور متحرک کرنا ہے کہ وہ جس طرح ماضی میں ترقی کی منازل طے کیا کرتے تھے آج بھی کر سکتے ہیں،اور آج بھی وہ محنت اور لگن سے مختلف علوم میں تحقیق کر کے دنیائے سائنس کی امامت سنبھال کر اقوامِ عالم کی خدمت کر سکتے ہیں۔بیسویں صدی کے اواخر میں عبدالسلام اور احمد ذویل نے نوبیل پرائز لے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ آج بھی کسی سے کم نہیں۔مصنف یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے لئے ان کے اندر سائنسی رجحانات اجاگر کرنے اور ترغیب دینے کا انمول کام کیا ہے جس سے مسلم طلباء کے عزم وحوصلہ میں ترقی ہوگی اور اہلِ عالم ان سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

جنید عبدالقیوم شیخ اگر چاہیں تو اس کتاب کو انگریزی میں بھی طبع کروا کر بھارت اور پاکستان سے باہر کے دیگر مسلم ممالک کی لائبریریوں کو پیش کر سکتے ہیں۔آخر میں خاکسار ایک مختصر سی نظم بہت احترام کے ساتھ مصنفِ کتاب کی نذر کرتا ہے:

(نظم)

یہ ہے پستک ایک کوزہ بند جس میں بحر ہے
کالے لفظوں سے نکلتی روشنی کی لہر ہے
عرق ریزی اس کے اندر محترم قیوم کی
سائینسدانوں سے ہے دل میں جن کے پنہاں روشنی
تذکرے خدمات کے ہیں علم کے میدان کے
گوہرِ نایاب اس میں روشنی پھیلا رہے
تذکروں سے ہے بھری جو سائنساں اسلام کے
لوگ وہ ، سارا جہاں واقف ہے جن کے نام سے
اس کا ہے آغاز جابر اور آخر میں ذویل
علم کے جھنڈے گڑھے ہیں دہر میں جن کے طفیل
سائنسدانی کے تھے ماہر حضرتِ عبدالسلام
ہمعصر بھارت میں ان کے حضرتِ عبدالکلام
سوچ جن کی با ہنر ہے یہ کتاب ان کے لئے
اونچے اونچے کام کرنے کے ہیں جن کے حوصلے
اے منوّر میں بہت ممنون ہوں جُنید کا
وہ بہت ہیں مہرباں کہ مجھ کو یہ تحفہ دیا

نتیجہءفکر: ڈاکٹر منوّر احمد کنڈے،ٹیلفورڈ،انگلینڈ

عرض قیس

شہزاد قیس

یہ ایک کتاب نہیں ہے اور شاعری تو ہرگز نہیں ہے۔ یہ اُس شوخ، پری زاد حُسن کی کہانی ہے جس کے میٹھے لبوں پر ''مَن دَر'' اُ کھڑنے تک تو رام رام رہا مگر پھر کمال بے نیازی سے ''کہلوا'' دیا گیا: ''حضور! حوریں دُنیا میں نہیں ملا کرتیں''۔ یہ چلمن کے چنچل دورِ حکومت میں پیاسی نگاہوں کی من بیتی بھی ہے اور ذکرِ یار میں محو دھڑکنوں کا من وعن گوشوارہ بھی اُس نے کہا، تھیں ہجر میں کُل کتنی دَھڑکنیں؟ میں نے حسابِ زیر وزَبر، پیش کر دیا۔ یہ قصہ ہے تنِ تنہا بزم آرائی کی اس ناکام کوشش کا جس میں دن ڈھلے فوجِ تنہائی کو شکست دینے کے لیے، شکستہ آئینوں کا ہجوم اکٹھا کیا گیا تو شب ڈھلے دائرہ وار شمعیں جلا کر گری باجماعت کا اہتمام کیا گیا۔ ''طاق'' راتوں میں کبھی گجروں میں لفظ پرو کر بے چین دِل کو بہلایا گیا تو کبھی عکسِ یار سے گفتگو کی ''سعی'' کی گئی عکسِ لیلیٰ سے قیس بات تو کر عین ممکن ہے بات ہو جائے۔

یکم مئی 1994 سے شروع ہونے والی یہ ''زنجیرِ خیال'' کئی دہائیوں پر مشتمل ''دُنیاوی بن باس'' کی قسطِ اوّل ہے۔ ذرا تاخیر کی اگر پہلی وجہ تخلیقی ارتقاء کا زمانی بہاؤ کا محتاج ہونا ہے تو دوسری وجہ تنہائی چھن جانے کا خوف ہے۔ کیونکہ جس کا کُل اثاثہ ہی زندانِ ذات میں ''خودساختہ'' عمر قید ہو، اس کے لیے یہ کافی مہنگا سودا ہے ایک تنہائی، دُوسری دَھڑکن شاعری تیسری سہیلی ہے۔

پھر یہ بھی حل طلب تھا کہ سینے میں ''امانتاً'' فراموش شدہ ان جذبات کو سپرِ دِخاک ہونا ہے یا سپردِ قلم۔ اور یہ فکر تو دامن گیر تھی ہی کہ شاعر کہلائے جانے پر ان اصحابِ دانش کو کیا منہ دکھاؤں گا جو مجھے ''کام کا آدمی'' سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس بناء پر ''جب تک ہو سکا'' اس ''قرطاسِ ابیض'' کی اشاعت ٹالی جاتی رہی داستانِ دردِ دِل ہے، یہ اَلف لیلیٰ نہیں قیس! چھپوانے سے پہلے خیرخواہوں سے تو پوچھ لیلیٰ نام کی بابت گزارش ہے کہ ایک تو قیس کی انتہائے نگارش کا اسمِ اعظم سوائے لیلیٰ کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ دوسرے یہ معمہ ابھی تک سمجھ سے باہر ہے کہ اس کلام کا ''اصلی'' خالق کون ہے۔ ایک جانب عشق میں ڈوبا قلم ہے جو شب ہنگام، نیم الہامی کے عالم میں، دلکش ''مگر'' بے جان لفظی مورتیں تراش سکتا ہے تو دوسری طرف وہ سحر انگیز حسن ہے جس کا مہکتا خیال بھی اِن بتوں میں ''رُوحِ شاعری'' پھونک دینے پر قادر ہے۔ چونکہ ''سنا'' ہے کہ رُوح پھونکے بغیر بت بنانا حرام ہے اس لیے یہ شعر ندائے دل معلوم ہوتا ہے کہ اِک حسینہ نے شعر لکھے ہیں۔

قیس کا صرف نام چلتا ہے لیلیٰ اس عالمِ ''عالم'' فراموشی کا نام بھی ہے جب حبیبِ ہجر ہونے پر خیالِ یار، یار سے بھی پیارا لگنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ کمالِ جستجو میں یہ تک بھول جاتا ہے کہ گول زمین پر آبلہ پائی کے اس دائروی سفر کا اصلی محور کون تھا۔ ایسے میں اگر کبھی کبھی ارتکازِ فکر، شدتِ ہجر اور دائمی ذکر یکجا ہو کر بن طلب شمعِ باطن روشن کر دیں تو تعجب کیسا اِس قدر ڈھونڈا تجھے رَب مل گیا ہجر میں گزرا شباب اچھا لگا اگر کسی دوراہے پر اپنی اور محبوب کی خوشی میں سے ایک کا انتخاب درپیش ہو تو سچے عاشقوں کے لیے یہ انتخاب تکلفِ محض ہے کیونکہ رہروانِ عشق کا یک نکاتی منشور محبوب کی خوشی میں سے کسی ''ایک'' کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اب اگر کبھی آپ کو یہ لمحہ درپیش ہوا تو امید تو ہے کہ مجنوں کا ''اشارہ'' کافی رہے گا قیس تھا لاجواب لیلیٰ بھی جب سوال ایک کی بقاء کا تھا لیلیٰ رت جگے کی اُن کروٹوں کا بیان بھی ہے جب زخم شماری، اختر شماری سے بڑھ جانے کے باوجود کسی شوخ پر آنے والے پیار میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

یہ ان شریر لمحوں کی داستان بھی ہے جب گا ہک کی شدتِ طلب دیکھ کر رسد کو بالکل ہی روک لیا جاتا ہے اور نئی شرائط طے کرنے کے لیے تاریخ تک نہیں دی جاتی کہا: کوہِ ہمالہ میں رَواں کر دُوں جو جوئے شیر کہا: وہ شرطِ شیریں تھی، کہیں دُشوار ہے لیلیٰ لیلیٰ بچپن کی دلچسپ شرارتیں یاد آنے پر بے اختیار مسکرا اٹھنے کا نام بھی ہے اور بزرگوں کی نصیحت دیر سے یاد آنے پر ہاتھ ملنے کا نام بھی۔ یہ اگر حُسن کا جامِ جم ہے تو عشق کا جامِ سفال بھی ہے۔ اور یہ کبھی کبھی کسی پر احسان کرتے ہوئے زندگی میں ''آخری'' مرتبہ حیران ہونے کا نام بھی ہے اُس رُوپ کے ''دِفاع'' کے لیے قیس ایک دن میں ڈھال کو جھکا تو وہ شمشیر بن گئی جہاں لیلیٰ کسی دلنشیں کٹاری کی سفاک خوبصورتی اور سفلی مسکراہٹ کی تسبیح ہے تو وہیں نویدِ محبت کی کھُلی وعید بھی۔

یہ صنفِ حُسن سے صنفِ عشق پر بیتے دلچسپ ستم کا جگمگاتا نوحہ ہے۔ چنانچہ یہ ان لمحوں کی قصہ بھی ہے جب غصہ، اصولوں پر اتنا حاوی ہو جاتا ہے کہ آدمی فردکا انتقام قوم سے لے کر تسکین محسوس کرتا ہے بے وفا کا اُدھار نہ رکھا قیس ہم نے حسیں رُلائے بہت یہ اُن قصہ گو زاہدوں کی داستان بھی ہے جن کے دِل کے چار خانے توحیدی دعووں کے باوجود سائنسی طور پر ثابت ہیں۔ عشقِ مجازی سے ''بھی'' بے بہرہ لوگ عشق حقیقی کے دعوے دار بن بیٹھیں تو میاں ہم مجنوں ہی بھلے۔ تاہم دیوانہ ہو یا فرزانہ، واعظِ شہر سے سب کو بنا کر رکھنی ہی پڑتی ہے اِن کے پاس آتے ہیں توبہ کو حسیں چہرے بھی واعظِ شہر سے تا عمر بنا کر رکھنا تسلیم کہ آج کل سائے سے گفتگو کوئی بھی پہنچا ہوا فرد کر لیتا ہے لیکن پرچھائیوں کے کاندھے پر سر رکھ کر روتے روتے غش کھا جانے کو غالباً کچھ زیادہ جنون درکار ہے۔ دانشوری پر مُصر عزیزوں سے التماس ہے کہ مجنوں پر تہمتِ دیوانگی باندھنے سے پیشتر، احتیاطاً، اِک نظر لیلیٰ کو بھی دیکھ لیں۔ ہوسکتا ہے اس مرتبہ صبر کا پھل اور دیکھنے والوں کا دِل دونوں ہی چھری کی زد میں آ جائیں لیلیٰ کو دیکھ لو تو سمجھو گے قیس کیوں لیلیٰ، لیلیٰ کرتا ہے پھر اگر جنون کی امان ملے تو خواہشِ دیدِ لیلیٰ

رکھنے والوں عقلمندوں سے مجنوں یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرے کہ کیا آپ لیلیٰ کو انہی آنکھوں سے دیکھیں گے جو محض قبول صورت چہرے دیکھنے کی عادی ترین ہو چکی ہیں؟ کسے خبر کہ دیدِ لیلیٰ کے لیے "کم سے کم" دیدہ قیس درکار ہو نگاہِ قیس سے دیکھو ہمیشہ لیلیٰ کو صنم کسی کا بھی ہو، بے مثال ہوتا ہے پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ حُسنِ لیلیٰ، لیلیٰ کا حُسن نہ ہو بلکہ مجنوں کے شوقِ دیدار کا خورشید حُسنِ لیلیٰ کے آئینے میں سے منعکس ہوتا ہو۔ ایسے میں تو لیلیٰ صرف اُسی کو نظر آئے گی جو چشمِ مجنوں رکھتا ہو۔

چنانچہ بعید نہیں کہ باہر لیلیٰ ڈھونڈنے کی بجائے اپنے اندر کے مجنوں کو تلاش کرنا ہی رُوحِ عقل ہو۔ "وما علینا الا البلاغ"۔

ہم کب آزاد ہوں گے

محمد قیصر شیراز

"سفید اُجلے کپڑے پہنے اُوپر اَچکن سب سے الگ تھلگ شاید کاغذی کپڑے کی سختی سے اندام انسانی بھی گردن اَکڑائے بغیر نہیں جچتا۔ اسی لیے وہ بھی شاید... ارے او بیگم...... کہاں مرگئی۔ ہلکی سی خنکی لب و لہجہ میں معمول کی تھی۔ اثنائے شنید بیگم اور انتظار اور بازوؤں کے کف باندھتے باندھتے اچانک پان کی پیک مقررہ ہدف کے بجائے اُجلے کپڑوں کو داغدار کر گئی گو ریلے کی سی کرختگی اور گونج سے تو بیگم کی جان ہی نکل گئی سٹ پٹائے دوڑتی کیا نہ کرتی... سر پہ دوپٹہ درُست کرتے کرتے... ہاں جی آئی... ابھی مم میں یہاں ہوں... دُزدیدہ نگہ سے ماجرا بھانپتے ہوئے بیگم آتے ہی جج... جی... غصے سے آنکھیں موندھ کر پیک نشانے پہ اس بار پھینک کر غصے کے آلاؤ کو کچھ کم کیا... کچھ بولنے سے قبل منہ کے آڑھے ٹیڑھے ماڈل اور ماڈل کرولا کے اضافت کیساتھ ڈیزائن دریافت کئے اور بولتے ہی بغیر ٹکٹ سوار ہو گیا وہ لگی بیچاری تکلیف کا مداوا کرنے...... پانی کیا زیادہ ڈال گئی...... لگا دانت پیسنے...... مشکل سے خود کو روکا... ورنہ گالی کم سے کم ایک تو نقد تیار تھی۔ دامن نچوڑتے آگ بگولہ گھر سے نکل گیا...... 14 اگست کتنے مہینوں بعد پلٹی ہے انگلیوں پہ گنتے گنتے گلی سے اِتراتا گزر گیا۔ شرق و غرب جھنڈوں اور جھنڈیوں سے کھچا کھچ اور... شب سماں باندھنے کے لیئے دیے بھی تیار تھے... مگر ارضِ وطن کی فضا میں عجیب ہر سال کی طرح سکوت تھا...... بجھے بجھے چہرے گھٹن بھی نشاط پر... ریڑھی کے اس پار ایک کرایہ گن رہا تھا اور ماتھے پہ سلوٹ بتا رہی تھی سٹاپ آچکا ہے اور پریشانی لاحق ہے کہ کرایہ سواریوں سے مطابقت رکھتا ہو...... ساتھ ہی ڈرائیور منتظر کسی مسافر کا... امید اور قسمت کو منہ میں جمع تفریق کرتا ہوا سڑک کے کنارے بھیک منگا کن اکھیوں سے آتے جاتے کو دیکھ رہا ہے۔ ساتھ حجام کھڑا شیو کرتے کرتے ریڈیو پہ مہدی حسن کے سر تال ٹھیک کرواتے ہوئے "یہ وطن تمہارا ہے" کی lipsing کر رہا ہے...... شدید گرمی میں کاٹن پر پسینہ پانی کی لکیر لئے... براستہ شلوار اسکے تلوے چاٹنے لگا...... گرمی سے زیادہ خجالت کا سامنا وہ کر رہا تھا۔ بین سے بٹن کھولے اور کالر گردن سے پیچھے تک لے گیا۔ اور ملک کی طرح گردن آزاد ہونے پر لمبی سانس شکرانے کی لی...... اور لگا ریڑھی پہ پھل فروٹ ترتیب دینے...... ارضِ وطن میں اس ایک شخص سے ملتا جلتا کردار ہر شعبے میں آسانی سے میسر ہے...... اُتر دکھن پورب پچھّم ہر جہت مایوس لوگ ذہنی اُلجھن سے گھرے پسماندہ کیڑے مکوڑے یا پھر...... یہ لوگ اَن پڑھ غیر اخلاقی طرز بود و باش غلامی کی گڑتی مجبوروں محروموں اور مقتولوں کا ملک حاکم آج بھی حکومت میں ہے کل بھی تھا۔ بقول فیض۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

دنیا کے نقشے پر 69 برس کا اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوا چاہتا ہے... اس ملک میں 20 کروڑ زندہ لاشیں مخبوط الحواس بے رحم گنوار حیوان ناطق پر لاکھ لوگ حکمرانی جبکہ باقی زندگی کی لکیر سے نیچے survival war for life لڑتے لڑتے گزر جائیں گے......

حبیب جالب آج بھی نوحہ کناں ہے
یہ لوگ بھی کیا لوگ ہیں مر کیوں نہیں جاتے

اور میرے سامنے ننگے پاؤں کھڑی ننھی بچی کی اُمنگیں اور کچھ اُبلتے ہوئے آنکھوں میں خواب ہمیشہ کی طرح مجھے آج بھی مجبور کیے ہوئے ہیں کہ خود سے پوچھوں...... اسکی طرح کروڑوں آنکھیں اربوں سوال لئے جواب کی منتظر... اور ناکامی پر حب الوطنی خود میں ڈھونڈتی ہیں...... اور میں سوچتا رہتا ہوں...... زمین کا ٹکڑا آزاد ہو کر 69 ویں برتھ ڈے منا رہا ہے...... مگر چلتے پھرتے سانس لیتے یہ اداس چہرے کب آزاد ہوں گئے؟ اور اگر آزاد ہو۔ بھی جائیں تو اب کی بار کس کھجور پہ لٹکیں گئے......

شیخ سعدی سے کسی نے پوچھا حضرت کیا آپ دنیا میں کسی سے نفرت کرتے ہیں..؟ سعدی نے مختصر جواب دیا، "نہیں" سوال کرنے والے نے دوسرا سوال کیا، کیا آپ ان سے بھی نفرت نہیں کرتے جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں......؟

سعدی نے کہا "نہیں" سوال کرنے والے نے سوال کیا۔ کیا آپ ان سے بھی نفرت نہیں کرتے جو آپ سے نفرت کرتے ہیں......؟ سعدی نے مسکراتے ہوئے کہا "نہیں، کیونکہ میں محبت کرنے والوں کے ساتھ اتنا مصروف رہتا ہوں کہ کسی سے نفرت کرنے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ کیا کہنے!

گیارہ مہینے بھوکوں کے سامنے مرغے پھاڑتے ہوئے انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی بھوکے بندے کے جذبات مجروح ہوں گے۔ایک مہینہ جب خود بھوکے ہوں اور کوئی بھوکا ان کے سامنے کھالے تو ان کہ جذبات مجروح ہوجاتے ہیں اور لڑائی مار کٹائی پہ اتر آتے ہیں! احترام رمضان تو مسلمانوں نے سیکھ لیا ہے احترام انسانیت پتہ نہیں کب سیکھیں گے؟

ابن انشاء ''اردو کی آخری کتاب'' سے اقتباس

وسیم الطاف

دائرے کی تعریف۔یوں تو دائروں کی بہت سی قسمیں ہوا کرتی ہیں لیکن ہمیں ایک ہی قسم کا دائرہ مہیا ہے جسے ''دائرہ اسلام'' کہا جاتا ہے کہ جوں جوں ملاؤں کا پیٹ پھیلتا تو اس دائرے کا حدود اربعہ سکڑتا جاتا ہے۔سنا ہے کہ پہلے کبھی اس دائرے میں اندراج بھی ہوا کرتا تھا مگر آجکل داخلہ سختی سے منع ہے صرف اخراج ہی اخراج ہوا کرتا ہے۔بھئی آپ کا ماضی اگر اتنا ہی شاندار اور قابل تقلید ہے اور پوری انسانیت کی بھلائی اور ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کا دعویٰ دار ہے تو آپ سوال سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں اور توہین کے نام پر تنقید کا سر کیوں کچلتے ہیں؟ لوگ سچ جاننا چاہتے ہیں اور دنیا کا کوئی بھی سچ سوال کو اُٹھائے بغیر سامنے نہیں آسکتا۔نصاب میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کو ہیرو بنا کر اور ٹیلی وژن چینلوں پر مکمل ضابطہ حیات کا ڈھنڈورا پیٹ کر آپ کچھ لوگوں کو کچھ وقت کے لیے تو بے وقوف بنا سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کی آنکھوں میں دُھول نہیں جھونک سکتے۔آپ لوگوں کے ذہنوں میں جھوٹ بھرتے ہیں اور انہیں امن اور سلامتی کے نام پر نفرت اور تشدد کا درس دیتے ہیں اسی لیے سچ کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں اور توہین اور وطن سے غداری کے نام پر لوگوں کے گلے کاٹتے ہیں اور ان کے سروں میں گولیاں مارتے ہیں۔

چہرے اور علمائے سُو

ابراہیم عابد

خوبصورت لڑکی سامنے ہو تو مولوی نہ تو اپنا سٹیٹس دیکھتا ہے نہ لڑکی کا۔نہ اپنی عمر دیکھتا ہے نہ لڑکی کی۔نہ دین کا خیال رکھتا ہے نہ دنیا کا۔نہ قرآن کا حوالہ یاد رہتا ہے اور نہ حدیث کا۔نہ دنیا کا سوچتا ہے نہ آخرت کا۔نہ تو جنت دکھتی ہے اور نہ دوزخ!۔ان حالات میں لڑکی مولوی سے کچھ بھی کرواسکتی ہے۔چاہے سلفیاں بنانی ہوں یا اس سے آگے جانا ہو۔ابھی خبر آئی ہے کہ مفتی عبدالقوی کو رویت ہلال کمیٹی سے نکال دیا گیا ہے اور غیر مصدقہ خبر ہے کہ ان کی زوجہ خلع کی درخواست دینے چلی...ہیں۔نیز یہ کہ قندیل بلوچ کی ہٹ لسٹ پہ ابھی درجنوں دوسرے مولوی ہیں۔اللہ تعالیٰ قندیل کو اپنے مشن میں کامیابی عطا فرمائیں اور مولویوں کے اصل چہرے سامنے آئیں۔آمین!

عمران خان

کے صوبے خیبر پختونخواہ کے سالانہ بجٹ میں عوام کے ٹیکس کے پیسوں میں سے تیس کروڑ کی خطیر رقم مدرسہ دارلعلوم حقانیہ کے لئے مختص کی گئی ہے جبکہ اسی بجٹ میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کی رقم میں سو فیصدی سے بھی زیادہ کمی کی گئی ہے۔یاد رہے یہ وہی مدرسہ ہے جسکے سربراہ مولانا سمیع الحق کو طالبان کا باپ مانا جاتا ہے،جس میں بے نظیر بھٹو کے قتل کی منصوبہ سازی کی گئی تھی اور جسکے صرف چند ایک نامور طلباء میں طالبان کا مرحوم سربراہ ملا عمر، ایک اور طالبان کا سربراہ جلال الدین حقانی، ابھی حال ہی میں ڈرون حملے میں ہلاک شدہ طالبان کا لیڈر ملا اختر منصور اور ہند و پاک میں القاعدہ کا سربراہ عاصم عمر کے نام ہیں۔

تبدیلی آنہیں رہی تبدیلی آچکی ہے

غور سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ جس قدر نوجوان دین سے برگشتہ ہورہے ہیں اس کے ذمے دار عقل فہم سے عاری ملا، پادری اور پنڈت ہیں۔جدید تنقید اور اعتراضات کے مقابلے کی سکت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ دھونس دھمکیوں اور قتل مقاتلے پر اپنے جیسے بے عقل اور جذباتی چیلے چانٹوں کو اکساتے ہیں اور آئے دن ان حیوانی جذبوں کو مزید بڑھاوا دے رہے ہیں۔۔جن دوستوں نے ''علامہ'' کوکب نورانی اوکاڑوی کی قتل اور تشدد پر اُکسانے والی تازہ ویڈیو دیکھی ہے وہ ان باتوں کی سچاء جان سکتے ہیں... یہ لوگ ہیں جو معصوم انسانوں کی لاشوں پر پل رہے ہیں۔۔۔

پارلیمنٹوں کے مذہبی فیصلے!

عاصی صحرائی

مذہب کی تاریخ میں ایک بات ہر دفعہ کھل کر سامنے آتی ہے کہ کفار منکرین مولوی وغیرہ ہمیشہ ریاستی جبر استبداد کا سہارا لیتے ہیں کہ کوئی ترکیب تو ہو کہ اس داعی الی اللہ کا منہ بند کردیا جاے اور اس ''فتنے'' کا تدارک ہو، کسی طرح اس آواز کو دفن کیا جائے... مگر بے سود! موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون مصر کے دربار میں بھی ایک ''بے سود'' فیصلہ ہوا جو آخر کار فرعون مصر کی ہولناک تباہی پر منتج ہوا..عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف بھی یہود کی 72 رکنی پارلیمنٹ کا متفقہ فیصلہ ہوا...کہ ''اس...مدعی کو دار پر چڑھا دو، صلیب پر ہلاک کردو''...بے سود! نہ یہود کا پارلیمنٹ رہا نہ ان کی شان شوکت!!! ایسی بربادی آئی جس کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے!! اور وہ جورات کی تاریکی میں مکہ کے اندر مکہ کے سرداران قریش نے اپنی ندوہ (پارلیمنٹ) میں سچوں کے سردار میرے آقا (فداہ امی وابی ونفسی) صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قرارداد پاس کیا تھا...کہ ''اس شخص کی آواز دبانے کے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اس کو قتل کردو''...مگر

خدا تعالیٰ کی غالب تقدیر نے ان دشمنوں کا نام نشان مٹا دیا...تمھارے اپنے پارلیمنٹ اور اس کے پنڈتوں اور فرعونوں کا انجام بھی مت بھولنا، یہ تو بس کل کی بات ہے میرے دوستو۔

انٹرنیٹ پر بھی مذہبی سوال و جواب کی ویب سائٹس پر ایسے لوگوں کے سوالات بکثرت پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کچھ سوالات ملاحظہ فرمایئے!"میں ایک ایسے دفتر میں کام کرتا ہوں جہاں خواتین بھی کام کرتی ہیں، وہاں اکثر خواتین کا کوئی ٹوٹا ہوا بال کسی کرسی یا صوفے پر نظر آ جاتا ہے،سوال یہ ہے کہ اگر ایسے کسی بال پر انجانے میں ہم بیٹھ جائیں تو کیا اس سے نکاح تو نہیں ٹوٹ جاتا؟"اکثر گھروں میں کئی سبزیاں مکس کر کے پکائی جاتی ہیں مثلاً آلو، مٹر اور گاجریں وغیرہ...سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنے سے ہم ملاوٹ کے مرتکب تو نہیں قرار پاتے؟"میں نے اکثر سنا ہے کہ نماز کے لیے وضو اور شادی کے لیے نکاح شرط ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا ایسا کہنا جائز ہے؟ کیونکہ شرط تو اسلام میں حرام ہے!

میرے موبائل کے"واٹس ایپ" میں اکثر کوئی دوست بیہودہ وڈیو بھیج دیتا ہے۔ میں ایسی وڈیو فوراً ڈیلیٹ کر دیتا ہوں لیکن دل مطمئن نہیں ہوتا۔ براہ کرم فرمایئے کہ ایسی صورت میں موبائل کو پاک کیسے کیا جائے؟

**۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ جوتوں پر لگانیوالی پالش میں الکوحل بھی استعمال کی جاتی ہے۔کیا اس صورت میں پالش والے جوتے پہننا حلال ہے؟ نیز یہ بھی بتایئے کہ کسی غیر مسلم سے جوتا مرمت کرانے سے گناہ تو نہیں ہوتا؟ ویسے تو میں سارے کام دائیں ہاتھ سے کرتا ہوں لیکن گاڑی چلاتے وقت مجبوراً بائیں ہاتھ سے گیئر لگانا پڑتا ہے۔کیا میری بخشش ہو جائے گی؟ اور یہ بھی بتایئے کہ اُلٹے ہاتھ سے موبائل فون سننا درست ہے؟ شلوار کی جیب رکھوانا کیسا ہے؟ اور کیا ایسی صورت میں جیب میں رکھے پیسے حلال ہیں؟ کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے!

میرا روزہ ہے

دسویں منزل کے کمرے کی کھڑکی سے اپنے بیٹی کو باہر کی دنیا دکھا رہا تھا اچانک ایک نوجوان رسّی سے لٹکا ہوا کھڑکی پر آ گیا"پانی چاہیئے۔"اتنی اونچائی پر بے خوف وہ ان دیواروں کو رنگ رہا تھا جن کے رنگین ہونے کا سکھ شاید ہی اسے ملے۔ میری بیٹی بہت پُر جوش ہو گئی کہ کوئی دیوار کی طرف سے کھڑکی پر لٹک کر بات کر رہا ہے۔"ڈر نہیں لگتا ہے"، یہ میرا پہلا سوال تھا...دیوار پر رنگ کا ایک کوٹ چڑھا کر کہنے لگا،"نہیں، خوف کیوں؟""کیا نام ہے؟""کامران" پھر کامران سے بات ہونے لگی ہے۔ بہار کے اُرریہ ضلع کا رہنے والا ہے۔ چھ مہینہ پہلے دہلی کمانے آیا ہے۔ دو دنوں تک بیٹھ کر دیکھتا رہا کہ کوئی کس طرح خود کو رسی سے باندھ کر لکڑی کی پٹڑی پر بیٹھ کر اتنی اونچائی پر تنہا رنگ کر رہا ہوتا ہے۔ تیسرے دن سے کامران خود یہ کام کرنے لگتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ"کوئی ٹریننگ ہوئی ہے تمہاری؟""نہیں.بس دیکھ کر سیکھ لیا"۔

"تو کسی نے کچھ بتایا نہیں کہ کیا کیا احتیاط برتنی چاہیئے؟""نہیں۔""تو تمہیں ڈر نہیں لگتا ہے نیچے دیکھنے میں؟""نہیں لگتا""اس سے پہلے کتنی منزل کی عمارت کا رنگ روغن کیا ہے تم نے؟"

37 منزل

میں سوچنے لگا کہ جہاں کامران کا بچپن گزرا ہو گا وہاں اُس نے اِتنی اونچی عمارت کبھی دیکھی تک نہ ہو گی لیکن دہلی آتے ہی تیسرے دن سے وہ اونچائی سے کھیلنے لگتا ہے۔"تو کیوں کرتے ہو یہ کام؟""اس میں مزدوری زیادہ ملتی ہے۔ رسک ہے نا!""کتنی ملتی ہے؟""پانچ چھ سو روپے ایک دن کے""پانی دیجیئے نا"میری دلچسپی کامران سے بات کرنے میں تھی۔ تیسری بار اس نے پانی مانگا۔اوہ، بھول گیا۔ ابھی لاتا ہوں۔گلاس لے کر آیا تو کامران نے اپنے ساتھ رنگ کرنے والے ایک اور شریف آدمی کی طرف گلاس بڑھا دیا۔ جب گلاس لوٹایا تو میں نے کہا کہ مجھے لگا کہ تمہیں پیاس لگی ہے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ کھڑکی کے باہر کوئی اور بھی لٹکا ہوا ہے۔"نہیں سر۔وہ ہندو ہے۔ اُسے پیاس لگی ہے"

میرا تو روزہ چل رہا ہے

ایک بوڑھا آدمی چپکے سے کھانے پینے میں مشغول تھا قریب سے گذرتے ہوئے نوجوانوں نے پوچھا۔ چچا کیا آپ نے روزہ نہیں رکھا؟ بوڑھے آدمی نے جواب دیا۔ میرا روزہ ہے صرف میں پانی پیتا ہوں اور کھانا کھاتا ہوں۔نوجوان ہنسنے لگے...یہ کیسا روزہ ہے؟ اس پر بوڑھے آدمی نے کہا میں کسی کی برائی نہیں کرتا۔ کسی پر بری نظر نہیں ڈالتا۔ کسی کو برا بھلا نہیں کہتا۔ کسی کا حق نہیں مارتا بے ایمانی نہیں کرتا۔ حرام نہیں کھاتا۔ سچ بولتا ہوں۔ کانوں سے غلط بات نہیں سنتا کسی کی غیبت نہیں کرتا۔ غلط راہ پر نہیں چلتا۔ اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ صرف بیماری کی وجہ سے میں اپنے معدے کو روزے دار نہیں بنا سکا۔ صرف پانی پیتا اور کھانا کھاتا ہوں۔ بوڑھے آدمی نے نوجوانوں سے پوچھا کیا آپ سب کا روزہ ہے؟ ایک نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہا نہیں ہم صرف پانی نہیں پیتے اور کھانا نہیں کھاتے۔

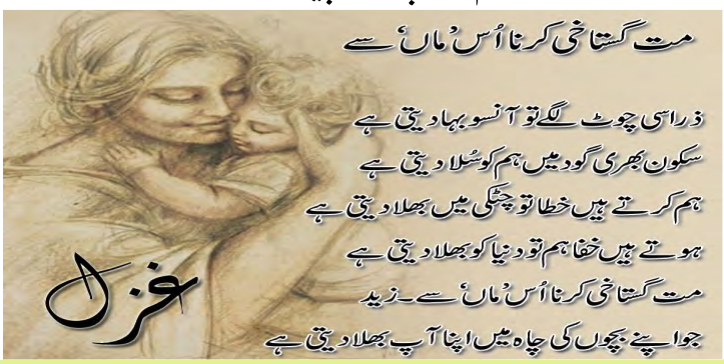

منافق معاشرہ۔ حنیف سمانا

روزہ کھلنے کے وقت جب میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا ریموٹ سے مختلف چینلز تبدیل کر رہا تھا تو مجھے ایک عجیب سی یکسانیت نظر آئی..... ہر چینل پہ کچھ زرق برق مولوی صاحبان بمع رنگ برنگی قیمتی شیروانیاں یا کڑھائی والے اورنج اور پرپل کلر کے قیمتی کرتے پہنے، سر پر رنگ برنگے عمامے یا ٹوپیاں لئے، ہاتھوں میں قیمتی گھڑیاں پہنے..... کہیں حمد باری تعالیٰ پڑھتے ہوئے تو کہیں نعت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سناتے ہوئے ..... چہرے پر میک اپ کا نور... آواز میں ملی جلی کیفیت ..... کچھ روزے کی وجہ سے سوز..... اور کچھ بھاری معاوضے کی وجہ سے سختی... ان کے آگے پلیٹوں میں دنیا بھر کی نعمتیں سجی ہوئیں... اور ساتھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقے سے پیٹ پر پتھر باندھنے کے ذکر پر ان مولوی صاحبان کا آبدیدہ ہونا..... پھر منہ بنا بنا کے ''رمضان'' کی فضیلت بیان کرنا...

یہ سوسائٹی..... عجب تضادات کا شکار ہے... ہمارے قول و عمل ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں متضاد ہیں... ہم عجیب منافق لوگ ہیں... ذرا سوچئے کہ یہ سب کچھ ٹی وی کے ذریعے اس محروم گھر میں بھی دیکھا جا رہا ہے جہاں ماں اپنے بیٹے کو آواز دے کے کہتی ہے... بیٹا... روزہ کھلنے کا وقت ہونے والا ہے... یہ لے ڈیڑھ سو روپے..... جا چھ سموسے آلو کے لے لے... سب کے لئے ایک ایک... اور چھ کیلے... اور تیس روپے کے پکوڑے..... اور بات سن..... کل تو نواب کی اولاد ایک سو بیس روپے درجن والے کیلے لایا تھا اتنے بڑے بڑے... وہ نہیں چاہئیں... چھوٹے لینا... ساٹھ ستر روپے درجن والے... تھوڑے سے گلے ہوئے ہوں گے تو بھی چلیں گے... اور بیس روپے کا برف بھی لیتے آنا... تیرا ابا ابھی کام سے تھکا آئے گا تو چینی کا شربت مانگے گا..... کیا سمجھا!'' بیٹا کہنے لگا... اماں..... یہ سب ڈیڑھ سو میں نہیں آئے گا... دو سو روپے دے۔''

ماں سوچ میں پڑ گئی... دو سو کہاں سے لاؤں... گھر میں یہ آخری ڈیڑھ سو تھے... پھر کچھ سوچ کے بولی.. ایسا کر ایک سموسہ اور ایک کیلا کم کر دینا... ویسے بھی میرے پیٹ میں درد ہے... کوشش کر اسی میں آ جائیں... جا جلدی جا بیٹا... روزے کا ٹائم ہونے والا ہے۔'' افطارِ صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے۔ جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو۔ روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے۔

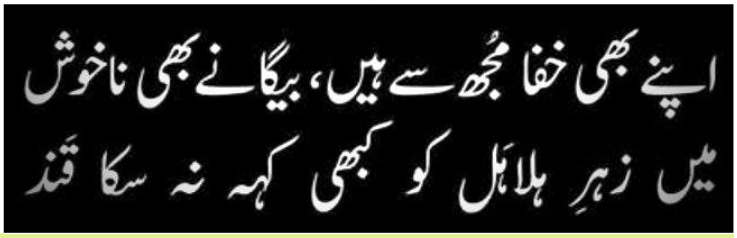

ملاحظاتِ کاشغری (نجم الثاقب کاشغری)

چند ہفتے قبل دو خبریں ایسی پڑھنے کو ملیں جن کا بظاہر آپس میں کوئی ربط یا جوڑ نظر نہیں آتا لیکن اپنے فارغ اور خالی دماغ کا کیا کہیں کہ جب بھی موقع ملے دور کی کوئی نہ کوئی کوڑی ڈھونڈ ہی لاتا ہے۔ ایک اندھا اندھیرے میں اور کر بھی کیا سکتا ہے، گو کئی معروف (یعنی پیشہ ور) صحافیوں نے اب یہ کام کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ آمدم بر سر مطلب، جناب پہلی خبر تو یہ ہے کہ قندیل بلوچ کے قتل کی تفتیش کا دائرہ بڑھا کر اس میں مقتولہ کے اہل خانہ کے مزید افراد کے نام بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ جبکہ دوسری خبر یہ ہے کہ خادم اعلیٰ پنجاب نے چین کی درخواست پر پاکستان میں کام کرنے والے چینی ماہرین کی حفاظت پر مامور فورس کی نفری بڑھا کر کئی گنا زیادہ کر دی ہے۔ چینی پراجیکٹ اور قندیل بلوچ کے افسوسناک قتل کا آپس میں کیا تعلق ہے؟، ظاہر ہے کچھ بھی نہیں۔ لیکن تعلق جو ہمیں نظر آیا ہے وہ اس اشتراک میں ہے جو قندیل بلوچ اور چینی ماہرین کی ان درخواستوں میں ہے جو دونوں نے پاکستانی حکام سے اپنی اپنی حفاظت کے حوالے سے ارباب اختیار یا ارباب حکومت سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر کی تھیں۔ پتہ نہیں کہ قندیل بلوچ نے چین کی طرح حکومت پاکستان سے باضابطہ طور پر سیکیورٹی میسر کرنے کی درخواست کی تھی یا نہیں لیکن خبروں کے مطابق مبینہ طور پر پاکستانی پولیس اس کی جان کو لاحق خطرے سے کسی حد تک آگاہ ضرور تھی۔

کافر اور غیر اسلامی جمہوری ممالک میں تو یوں ہوتا ہے کہ اگر کسی نے جان جانے کے خوف سے پولیس کو سیکیورٹی مہیا کرنے کی درخواست دی ہو اور پولیس کی عدم توجہی کے باعث وہ شخص جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو تفتیش کا دائرہ کار بڑھا کر اس میں اول طور پر ان پولیس والوں کے نام شاملِ تفتیش کر لئے جاتے ہیں جن کی لاپرواہی اور عدم توجہی سے اس شخص کی جان چلی گئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ شرم اور ضمیر کے بوجھ سے متعلقہ پولیس افسر از خود استعفیٰ بھی دے دیتے ہیں اور بعض پولیس والے تو شرم کے مارے خود کشی بھی کر لیتے ہیں۔ پتہ نہیں کہ قندیل قتل کیس میں ان پولیس والوں کے نام بھی شامل کئے گئے ہیں یا نہیں جنہیں اس کی جان کو لاحق خطرے کا علم تھا لیکن اس پر کوئی ایکشن لینا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔ شاید اس لئے کہ وہ کوئی غیر ملکی ''ماہر'' نہیں بلکہ ایک غریب (لیکن ''غیرت مند'') پاکستانی گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک پگلی لڑکی تھی۔ لیکن ہمارے لیڈر الیکشن سے قبل اپنی تقریروں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کا حوالہ کیوں دیتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو اس کا ذمہ ان پہ ہوگا۔ شاید حکومت وقت بیچاری قندیل بلوچ کو ایک پاکستانی شہری، ایک انسان تو کیا ایک حیوان تک بھی نہ

سمجھتی ہو۔حالانکہ جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ قندیل بلوچ اور اس کے خاندان کی بھوک ہی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسے کام کرنے پر مجبور ہوگئی جو بالآخر کچھ جہلاء کے ہاتھوں اس کی ایک دردناک موت پر منتج ہوگئے۔

حقیقت یہی ہے کہ پاکستانی عوام بیچارے حیثیت ہی کیا رکھتے ہیں۔آج تک کسی بھی پاکستانی حکمران نے پاکستانی عوام سے ایسی کوئی دوستی قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جو پاک چین دوستی کی طرح ''شہد سے بھی میٹھی، ہمالہ سے بھی بلند اور سمندر سے بھی گہری'' ہو۔اس کے برعکس پاکستانی حکمرانوں کی عملاً ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ان کے اور پاکستانی عوام کے درمیان ہمالہ سے بھی بلند کوئی رکاوٹ اور سمندر سے بھی گہری کوئی خلیج اگر پیدا ہو سکے تو بہتر ہے۔ ہمارے عظیم ''قائد عوام'' سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا وہ وڈیو کلپ نام نہاد جمہوریت کے حوالے سے بڑے فخر سے دکھایا جاتا ہے جس میں وہ اپنے سامنے کھڑے کالے کلوٹے ڈھانچہ نما پاکستانی عوام سے پوچھتے نظر آتے ہیں کہ ''لڑو گے؟''.....''مرو گے؟''، اور جواب میں وہ عوام بیچارے اپنے سوکھے سڑے پنجہ نما ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتے نظر آتے ہیں ''ہاں لڑیں گے!، مریں گے!'' تاریخ گواہ ہے کہ ایک قائد عوام اور عوام کے درمیان ہونے والے اس تاریخی ''عہد و پیماں'' کے بعد سے ہمارے عوام اپنے محبوب قائد سے کئے ہوئے اس عہد کو نبھاتے ہوئے ہنوز لڑتے اور مرتے ہی چلے آرہے ہیں۔آج کراچی میں اسی ''نانا کی جان'' بلاول بھٹو کا پروٹوکول بھی ہمیں ایک غریب، معصوم اور بیمار بچی کے خون سے ہاتھ دھوتا نظر آتا ہے۔اور ستم بالائے ستم عوام کو یہ یاددہانی بھی مختلف وقفوں سے بار بار کروادی جاتی ہے کہ ہر گھر سے ابھی کتنے ہی بھٹو نکلنا باقی ہیں۔ان سب کا پروٹوکول نجانے اور کتنے معصوموں کی جان لے لے گا؟۔معاف کیجئے بات ہو رہی تھی سیکیورٹی کی درخواست پہ اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

جہاں تک سیکیورٹی کا تعلق ہے تو سچی بات تو یہ ہے کہ بیچاری پاکستانی پولیس کو کیا الزام دیں اور کیا شامل تفتیش کریں انہیں تو خود اپنی سیکیورٹی کے حوالے سے جائز طور پر شدید خدشات لاحق رہتے ہیں۔ اسی طرح جب جنرل پرویز مشرف جیسا ''چیف ایگزیکٹو'' بذات خود بے نظیر بھٹو جیسی ہر دلعزیز لیڈر کو یہ کہہ کر منع کر رہا تھا کہ وہ پاکستان واپس نہ آئیں کیونکہ حکومت پاکستان انہیں کسی تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتی اور پھر واقعتاً ان کی بات سچ بھی ثابت ہوگئی تو ایسے میں کسی قندیلؔ یا کسی بلوچؔ وغیرہ کی جان کے تحفظ اور اس کی ضمانت کا کیا رونا رویا جاسکتا ہے۔بلوچستان میں کوئٹہ ہسپتال کے حالیہ سانحہ کے بعد جناب جنرل راحیل شریف صاحب نے ''کنگھی (Combing) آپریشن'' شروع کرنے کا عندیہ دیا ہے۔اب تو شاید ''کنگھی'' کرنے کی نہیں استرا پھیر کر سارا سر منڈوا دینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے چاہے اس کے بعد اولے ہی کیوں نہ گریں!۔پتہ نہیں کنگھی پھیرنے کا خیال اس وقت کسی کے ذہن میں کیوں نہیں آیا جب کوئٹہ کی ہزارہ کمیونٹی کے بیک وقت پچاس پچاس بلکہ ستر ستر بے گناہ افراد کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کر ہمیشہ کی نیند سلایا جارہا تھا۔ع کچھ 'جواب' اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ سال 1992ء نماز فجر کے بعد کا وقت تھا ابھی صبح کا اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ابا جان نے دروازہ

گدھا وزیر-عامر سہیل

ایک بادشاہ نے اپنے بہنوئی کی شفارش پر ایک موسمیات کو وزیر لگا دیا۔ایک روز بادشاہ شکار پر جانے لگا تو روانگی سے قبل اپنے وزیر موسمیات سے موسم کا حال پوچھا۔وزیر نے کہا موسم بہت اچھا ہے اور اگلے کئی روز تک اسی طرح رہے گا۔بارش وغیرہ کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔بادشاہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ ہوگیا۔راستے میں بادشاہ کو ایک کمہار ملا۔اُس نے کہا حضور آپ کا اقبال بلند ہو، آپ اس موسم میں کہا جارہے ہیں؟ بادشاہ نے کہا شکار پر۔کمہار نے کہا حضور! موسم کچھ ہی دیر میں خراب ہونے والا اور بارش کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ بادشاہ نے کہا ابے او برتن بنا کر گدھے پر لادنے والے تم کیا جانو موسم کیا ہے؟ میرے وزیر نے بتایا ہے کہ موسم نہایت خوشگوار اور شکار کے لئے نہایت موزوں اور تم کہہ رہے ہو کہ بارش ہونے والی ہے؟ بادشاہ نے ایک مصاحب کو کہا کہ اس بے پر کی چھوڑنے والے کمہار کو دو جوتے مارے جائیں۔بادشاہ کے حکم پر فوری تعمیل ہوا اور کمہار کو دو جوتے نقد مار کر بادشاہ شکار کے لئے جنگل میں داخل ہوگیا۔ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے۔ایک آدھ گھنٹہ بعد گرج چمک شروع ہوئی اور پھر بارش۔ بارش بھی ایسی کہ خدا کی پناہ طوفان بادد باراں۔ ہر طرف کیچڑ اور دلدل بن گیا۔ بادشاہ اور مصاحب کو سارا شکار بھول گیا۔جنگل پانی سے جل تھل ہوگیا۔ایسے میں خاک شکار ہوتا۔بادشاہ نے واپسی کا سفر شروع کیا اور بُرے حال میں محل واپس پہنچا۔واپس آکر دو کام کئے۔ پہلا یہ کہ وزیر موسمیات کو برطرف کیا اور دوسرا یہ کہ کمہار کو دربار میں طلب کیا اسے خلعت فاخرہ عطا کی اور وزیر موسمیات بننے کی پیشکش کی۔کمہار ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا، کہاں میں جاہل اور اَن پڑھ شخص اور کہاں سلطنت کی وزارت۔ مجھے تو صرف برتن بنا کر بھٹی میں پکانے اور گدھے پر لاد کر بازار میں فروخت کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا۔ مجھے تو موسم کا رتی برابر پتہ نہیں۔ہاں البتہ یہ ہے کہ جب میرا گدھا اپنے کان ڈھیلے کر کے نیچے لٹکائے تو اس کا مطلب ہے کہ بارش ضرور ہوگی۔ یہ میرا تجربہ ہے اور کبھی میرے گدھے کی پیش گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی۔بادشاہ نے کمہار کے گدھے کو اپنا وزیر موسمیات مقرر کر دیا۔سنا ہے کہ گدھوں کو وزیر بنانے کی ابتدا تب سے ہوئی۔

عبدالستار ایدھی صاحب سے چند ملاقاتیں

مکرم مبارک صدیقی صاحب

کھولا باہر کسی اجنبی سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ابا جان حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اندر آئے اور کہنے لگے باہر مکرم ومحترم عبدالستار ایدھی صاحب تشریف لائے ہیں۔کہتے ہیں مبارک صدیقی سے ملنا ہے۔

مجھ جیسے گلیوں میں بے مقصد پھرنے والے گمنام اور گمشدہ سے آدمی کیلئے یہ بہت غیر متوقع تھا۔جس شخص کو اکثر خبروں میں پڑھتا ہوں یا ٹی وی میں دیکھتا ہوں اسے مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ڈر بھی گیا کہ کہیں بیگم نے توفون نہیں کردیا کہ یہ شخص ہمیں نہیں چاہئے آکے لیجائیں۔باہر گیا تو واقعی محترم عبدالستار ایدھی تھے بہت محبت سے ملے۔اندر بٹھایا۔کہنے لگے آپ کی ایک ڈائری نما کتاب ''دوزخ سے جنت تک'' کسی دوست نے تحفے میں دی تھی۔میں پڑھ نہیں سکتا اس لئے عادت کے مطابق کتاب ایک طرف رکھ دی،گھر میں کسی نے پڑھی اور کہا کہ یہ کتاب آپ کو ضرور پڑھ کے سنانی ہے۔میں نے کہا میرے پاس وقت نہیں ہے۔پھر ایک شام جب وقت اور تنہائی میسر تھی تو کسی نے پڑھ کے سنائی۔اس میں ایک بات ایسی دل کو لگی کہ میں نے سوچا کہ اس بندے کو ضرور ملنا ہے اور مبارک صاحب جو میں سوچ لوں وہ کرنیکی کوشش ضرور کرتا ہوں۔غالباً ایک گھنٹہ ہمارے گھر تشریف فرما رہے۔

ناشتہ میری فیملی کے ساتھ کیا اور اگلی مرتبہ لاہور آنے پر دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہوئے۔حیرت انگیز طور پر کوئی ایک مہینے بعد دوبارہ اسی طرح نماز فجر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اب ذرا دن نکل چکا تھا۔کئی راہگیر رک کے انہیں دیکھ رہے تھے اور ہمارے گھر کے باہر محترم عبدالستار ایدھی صاحب کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے بلکہ تھوڑی دیر کے بعد ایک اخباری نمائندہ بھی ہمارے دروازے پر باہر کھڑا ہو گیا اور بار بار دروازہ پیٹنے لگا۔ناشتہ تیار کیا اور پیش کیا۔آج میں نے کہا کہ محترم آپ کی محبت عنایت اور شفقت کا معترف ہوں لیکن ایک بات ابتداء میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ بعد میں کہیں آپ کو یا آپ کی شہرت کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔مختلف مسالک ہیں۔ممکن ہے میرا مسلک آپ کے مسلک سے جدا ہو۔بہت مسکرائے بلکہ قہقہہ لگایا۔اٹھ کے گلے لگایا کہنے لگے جس نے کتاب تحفے میں دی تھی اس نے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔کہنے لگے وہ میرا کام

میرا مشن میری زندگی کا مقصد ہے انسانیت کی خدمت، کہنے لگے میرے ایک سوال کا جواب دیں اگر سڑک پر کوئی زخمی پڑا ہو تو کیا میں اس سے یہ پوچھوں کہ تم تمہارا مذہب یا مسلک کیا ہے۔کہنے لگے مبارک سے بھی اگر کوئی بھوکا کھانا مانگے یا مابے امان پناہ مانگے یا مشکل میں گرفتار مدد مانگے تو اس سے اس کا مذہب یا مسلک نہ پوچھنا۔پھر اس کے بعد آپ کوئی تین چار مرتبہ میرے گھر تشریف لائے۔بتانے لگے کہ میری ماں مجھے سکول جاتے۔ایک آنہ دیتی تھی اور کہتی تھی کہ جو بھی کھانے کیلئے لینا کسی دوست کو آدھا ضرور دینا۔کبھی ایک آنہ میرے لئے دیتی اور ایک آنہ اور دے کے کہتی کہ یہ کسی غریب بچے کو دے دینا۔کہنے لگے میں نے ایک ٹوٹی پھوٹی ایمبولینس خریدی تھی اور سارا دن گلیوں میں پھرتا تھا کہ کسی کو مدد کی ضرورت ہے تو بتائے۔

کہنے لگے شروع میں کوئی توجہ نہیں دیتا تھا تو محلے کے غریب بچوں اور بزرگوں کو سیر کرواتا تھا۔میں نے کہا ایدھی۔حب ہمارے ملک کے حالات کب اچھے ہوں گے۔کہنے لگے نظام بدلنے کی ضرورت ہے۔میں نے کہا سمجھ نہیں آئی۔کہنے لگے ہمارے ملک کے حالات تب ٹھیک ہوں گے۔جب ہمارے حکمران ہمارے ملک میں بسنے والے ہر انسان کو انسان سمجھیں گے بس۔اور وہ بھی برابر کے حقوق والا۔اور ہم عوام جب حقوق لینے کی بجائے حقوق دینے کی کوشش کریں گے۔کہنے لگے میرے ایدھی گھروں میں ہندو،سکھ اور عیسائی بچوں اور عورتوں کو بھی وہی کپڑے اور کھانا ملتا ہے جو مسلمان بچوں اور عورتوں کو ملتا ہے۔یہ بھی بتایا کہ مجھے شروع میں لوگ کنجوس کہتے تھے کیونکہ میں ایک ہی سوٹ دھو دھو کے پہنتا تھا لیکن میں ایمبولینس کیلئے پیسے جمع کر رہا تھا۔اب دو جوڑے میرے پاس ہوتے ہیں لیکن شادی کے بعد ایک ہی جوڑا ہوتا تھا۔یہ جوڑا دھوتے وقت میں بیگم سے ادھار دوپٹہ لے کے دھوتی بناتا تھا۔ایسی بہت سی دلچسپ باتیں سننے کا موقع ملا۔

ایک دن کہنے لگے کل ناشتہ تم نے میرے ساتھ کرنا ہے نماز فجر پڑھ کے میری طرف آجانا۔ملتان روڈ اور علامہ اقبال ٹاؤن زینت بلاک کیں ایک ایدھی ہاؤس تھا۔نماز فجر کے بعد میں وہاں پہنچا تو اچھا خاصا اندھیرا تھا۔دور سے نظر آرہا کہ ایک آدمی عمارت کی باہر کی دیوار کو رنگ سفیدی کر رہا تھا قریب جا کر دیکھا تو وہ

عبدالستار ایدھی تو وہ خود ہی تھے۔ ہاتھ تھام کے بڑی محبت سے اندر لے گئے ہاتھ دھو کے کہنے لگے آؤ مبارک صاحب ناشتہ کرتے ہیں۔ ساتھ دس پندرہ یتیم بے سہارا بچے لڑکے جو اس وقت تک اٹھ چکے تھے۔ انہیں بلالیا۔ سٹیل کی سادہ ترین پلیٹوں میں دال تھی۔ روٹی تھی چائے رس تھے۔ ناشتے کے بعد کہنے لگے کہ قریب ہی ایک بچی ہے۔ کینسر کی مریضہ ہے اسے ملنے جانا ہے۔ پیدل ہی میں بھی ساتھ ہی چل پڑا۔ راہگیر اور کاروں والے مڑمڑمڑ کے دیکھ رہے تھے۔.....اس بچی کے گھر پہنچے۔ بہت دیر بچی سے باتیں کیں۔ پھر اس کے والد کو باہر بلا کے کہا کہ ہمارے ڈاکٹروں نے بھرپور علاج کیا ہے لیکن بتایا ہے کہ آخری دن ہیں۔ پھر ایک اچھی رقم باپ کے حوالے کی کہ بچی کی خواہش تھی کہ ہمارے گھر ٹی وی ہو۔ آج ہی اس کی یہ خواہش پوری کرو۔ ایک دن نماز فجر کے بعد میرے گھر تشریف لائے بلقیس ایدھی صاحبہ کے ساتھ۔ ناشتہ ہماری طرف کیا۔ کہنے لگے کہ آج وزیراعظم صاحب سے بھی ملاقات ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا وہاں جانے کیلئے تو آپ خوب تیار وغیرہ ہو کے جائیں گے۔ بہت ہنسے کہنے لگے مبارک صاحب میں تو تیار ہو کے اور بہت خوبصورت بن کے گھر سے نکلا تھا لیکن آپ نے دل ہی توڑ دیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر انہیں غور سے دیکھا۔ ملیشے کے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اور پاؤں میں ہوائی چپل جس میں کم سے کم تین چار جگہ مرمت کے نشان واضح دکھائی دے رہے تھے۔

(روزنامہ یو کے ٹائمز لندن 14 جولائی 2016ء)

بخش لائلپوری کے متعلق

گوپی چند نارنگ

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بخش لائلپوری کی شاعری ایک بڑے ہی گہرے تفکر مشاہدے مثبت اندازِ فکر اور ایک متاثر کن لہجے کی شاعری ہے۔ اس میں رنگ تغزل اور انقلابی فکر بھی ہے۔ علائم اور تلازموں کا ایک خوبصورت نظام بھی ہے شاعری کی غزل میں ایک شعر بھی دل کو چھونے والا مل جائے تو اس غزل کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے لیکن میں کہوں گا کہ بخش لائلپوری کی اکثر غزلوں میں دل کو چھونے ولا ایک شعر تو کیا پوری کی پوری غزلیں نئے پن اور تازگی فکر سے عبارت ہیں جن کی تہہ میں کئی مفاہیم اور کئی مطالب پوشیدہ ہیں۔

حضرت یونس (ع) مچھلی کے پیٹ میں کیسے زندہ رہے؟؟

ڈاکٹر امروز جان ولسن فیلو کوئز کالج آکسفورڈ نے حضرت یونس (ع) کے مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنے کے بارے میں ایک مقالہ تھیولوجیکل ریویو میں تحریر کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ 1890 میں ایک جہاز فاک لینڈ کے قریب وہیل مچھلی کا شکار کر رہا تھا۔ اسکا ایک شکاری جیمس سمندر میں گر پڑا اور ایک وہیل مچھلی نے اسے نگل لیا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ مچھلی دو روز بعد پکڑی گئی۔ اسکا پیٹ چاک کیا گیا تو شکاری زندہ نکلا۔ البتہ اسکا جسم مچھلی کی اندرونی تپش کی وجہ سے سفید ہو گیا تھا۔ دو ہفتے کے علاج کے بعد وہ بلکل صحت مند ہو گیا۔ 1958 میں "ستارہ مچھلی" نام جہاز فاک لینڈ میں ہی مچھلیوں کا شکار کر رہا تھا کہ اسکا "بارکلے" نامی ملاح سمندر میں گر پڑا جسے ایک وہیل نے نگل لیا۔ اتفاق وہ مچھلی پکڑی گئی۔ پورا عملہ اسے کلہاڑیوں سے کاٹنے لگا۔ دوسرے دن بھی یہ کام جاری تھا کہ مردہ مچھلی کے پیٹ میں حرکت محسوس ہوئی۔ اسکا پیٹ چیرا گیا تو انکا ساتھی بارکلے نکلا جو تیل اور چربی میں لتھڑا ہوا تھا۔ بارکلے کو دو ہفتوں بعد ہوش آیا اور اپنی بپتا سنائی۔ بارکلے کے متعلق یہ خبر اخبارات و جرائد میں چھپی تو علم و سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ بہت سے لوگوں نے انٹرویو لیے۔ ایک مشہور سائنسی رسالے کے ایڈیٹر مسٹر ایم ڈی پاول نے تحقیق کے بعد لکھا کہ۔ "اس حقیقت کے منکشف ہونے کے بعد میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ حضرت یونس (ع) کے متعلق آسمانی کتابوں میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے"۔

1992 میں آسٹریلیا کا 49 سال ماہی گیر ٹورانسے کائس وہیل مچھلی کے پیٹ میں 8 گھنٹے رہنے کے بعد معجزانہ طور پر بچ گیا۔ وہ بحر ہند میں ایک چھوٹے ٹرالر پر مچھلیاں پکڑ رہا تھا کہ سمندر کی ایک بڑی لہر اسکے ٹرالر کو بہالے گئی۔ وہ کئی گھنٹوں تک سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اسی اثنا میں اسے یوں لگا جیسے کئی شارک مچھلیاں اسکی طرف بڑھ رہی ہوں۔ جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ دراصل وہ ایک بہت بڑی وہیل مچھلی کی زد میں ہے جو منہ کھولے اسکی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہیل نے اسے اپنے منہ میں دبا لیا لیکن اسکی خوش قسمتی تھی کہ وہ جبڑوں میں ہی چمٹا رہا۔ وہیل اسکو مسلسل نگلنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ برابر مزاحمت کرتا رہا جسکی وجہ سے اسکی آکسیجن مل رہی تھی اور وہ زندہ تھا۔ 8 گھنٹے کی اس جدوجہد کے بعد جبکہ وہ نیم بے ہوش ہو چکا تھا اس نے خود کو آسٹریلیا کے ایک ساحل پر پایا۔ دراصل مچھلی نے نگلنے میں ناکامی پر اس اگل دیا تھا یوں اسکی جان بچ گئی۔ ان سب نے یہ بات کی تھی کہ مچھلی کے پیٹ میں تہہ بہ تہہ تاریکی تھی اور وہاں سانس لینے میں کوئی مشکل نہ تھی۔! قرآن میں اللہ حضرت یونس (ع) کے بارے میں فرماتے ہیں۔۔۔!" آخر اس نے تاریکیوں میں پکارا"

برداشت کے قصے- صدر ایوب خان

صدر ایوب خان پاکستان کے پہلے ملٹری ڈکٹیٹر تھے' وہ روزانہ سگریٹ کے دو بڑے پیکٹ پیتے تھے' روز صبح ان کا بٹلر سگریٹ کے دو پیکٹ ٹرے میں رکھ کر ان کے بیڈروم میں آجاتا تھا اور صدر ایوب سگریٹ سلگا کر اپنی صبح کا آغاز کرتے تھے' وہ ایک دن مشرقی پاکستان کے دورے پر تھے' وہاں ان کا بنگالی بٹلر انہیں سگریٹ دینا بھول گیا' جنرل ایوب خان کو شدید غصہ آیا اور انہوں نے بٹلر کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ جب ایوب خان گالیاں دے دے کر تھک گئے تو بٹلر نے انہیں مخاطب کر کے کہا ''جس کمانڈر میں اتنی برداشت نہ ہو وہ فوج کو کیا چلائے گا' مجھے پاکستانی فوج اور اس ملک کا مستقبل خراب دکھائی دے رہا ہے''۔ بٹلر کی بات ایوب خان کے دل پر لگی' انہوں نے اسی وقت سگریٹ ترک کر دیا اور پھر باقی زندگی سگریٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔

رستم زمان گاما پہلوان:: آپ نے رستم زمان گاما پہلوان کا نام سنا ہو گا۔ ہندوستان نے آج تک اس جیسا دوسرا پہلوان پیدا نہیں کیا' ایک بار ایک کمزور سے دکاندار نے گاما پہلوان کے سر میں وزن کرنے والا باٹ مار دیا۔ گامے کے سر سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے' گامے نے سر پر مفلر لپیٹا اور چپ چاپ گھر لوٹ گیا۔ لوگوں نے کہا ''پہلوان صاحب آپ سے اتنی کمزوری کی توقع نہیں تھی' آپ دکاندار کو ایک تھپڑ مار دیتے تو اس کی جان نکل جاتی''۔ گامے نے جواب دیا ''مجھے میری طاقت نے پہلوان نہیں بنایا' میری برداشت نے پہلوان بنایا ہے اور میں اس وقت تک رستم زمان رہوں گا جب تک میری قوت برداشت میرا ساتھ دے گی''۔

ماؤزے تنگ:: قوت برداشت میں چین کے بانی چیئرمین ماؤزے تنگ اپنے دور کے تمام لیڈرز سے آگے تھے' وہ 75 سال کی عمر میں سردیوں کی رات میں دریائے شنگھائی میں سوئمنگ کرتے تھے اور اس وقت پانی کا درجہ حرارت منفی دس ہوتا تھا۔ ماؤ انگریزی زبان کے ماہر تھے لیکن انہوں نے پوری زندگی انگریزی کا ایک لفظ نہیں بولا۔ آپ ان کی قوت برداشت کا اندازا لگائیے کہ انہیں انگریزی میں لطیفہ سنایا جاتا تھا' وہ لطیفہ سمجھ جاتے تھے لیکن خاموش رہتے تھے لیکن بعد ازاں جب مترجم اس لطیفے کا ترجمہ کرتا تھا تو وہ دل کھول کر ہنستے تھے۔

ظہیر الدین بابر:: قوت برداشت کا ایک واقعہ ہندوستان کے پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر بھی سنایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے انہوں نے زندگی میں صرف ڈھائی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ان کی پہلی کامیابی ایک اژدھے کے ساتھ لڑائی تھی' ایک جنگل میں بیس فٹ کے ایک اژدھے نے انہیں جکڑ لیا اور بابر کو اپنی جان بچانے کیلئے اس کے ساتھ بارہ گھنٹے اکیلے لڑنا پڑا۔ ان کی دوسری کامیابی خارش تھی۔ انہیں ایک بار خارش کا مرض لاحق ہو گیا' خارش اس قدر شدید تھی کہ وہ جسم پر کوئی کپڑا نہیں پہن سکتے تھے۔ بابر کی اس بیماری کی خبر پھیلی تو ان کا دشمن شبانی خان ان کی عیادت کیلئے آ گیا۔ یہ بابر کیلئے ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ وہ بیماری کی حالت میں اپنے دشمن کے سامنے جائے۔ بابر نے فوراً پورا شاہی لباس پہنا اور بن ٹھن کر شبانی خان کے سامنے بیٹھ گیا' وہ آدھا دن شبانی خان کے سامنے بیٹھے رہے' پورے جسم پر شدید خارش ہوئی لیکن بابر نے خارش نہیں کی۔ بابر ان دونوں واقعات کو اپنی دو بڑی کامیابیاں قرار دیتا تھا اور آدھی دنیا کی فتح کو اپنی آدھی کامیابی کہتا تھا۔ دنیا میں لیڈرز ہوں' سیاستدان ہوں' حکمران ہوں' چیف ایگزیکٹو ہوں یا عام انسان ہو' ان کا اصل حسن ان کی قوت برداشت ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی شارٹ ٹمپرڈ' کوئی غصیلہ اور کوئی جلد باز شخص ترقی نہیں کر سکتا۔ دنیا میں معاشرے' قومیں اور ملک بھی صرف وہی آگے بڑھتے ہیں جن میں قوت برداشت ہوتی ہے۔ جن میں دوسرے انسان کی رائے' خیال اور اختلاف کو برداشت کیا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک' ہمارے معاشرے میں قوت برداشت میں کمی آتی جا رہی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ہر وقت کسی نہ کسی شخص سے لڑنے کیلئے تیار بیٹھا ہے۔ شائد قوت برداشت کی یہ کمی ہے جس کی وجہ سے پاکستان میں دنیا میں سب سے زیادہ قتل اور سب سے زیادہ حادثے ہوتے ہیں لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم اپنے اندر برداشت پیدا کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب ہاں ہے اور اس کا حل رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہے۔ ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے زندگی کو پر سکون اور خوبصورت بنانے کا کوئی ایک فارمولہ بتا دیجئے'' آپ ﷺ نے فرمایا ''غصہ نہ کیا کرو'' آپ نے فرمایا ''دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اول وہ لوگ جو جلدی غصے میں آجاتے ہیں اور جلد اصل حالت میں واپس آجاتے ہیں۔ دوم وہ لوگ جو دیر سے غصے میں آتے ہیں اور جلد اصل حالت میں واپس آجاتے ہیں اور سوم وہ لوگ جو دیر سے غصے میں آتے ہیں اور دیر سے اصل حالت میں لوٹتے ہیں'' آپ نے فرمایا ''ان میں سے بہترین دوسری قسم کے لوگ ہیں جبکہ بدترین تیسری قسم کے انسان''۔ غصہ دنیا کے 90 فیصد مسائل کی ماں ہے اور اگر انسان صرف غصے پر قابو پا لے تو اس کی زندگی کے 90 فیصد مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ برداشت دنیا کی سب سے بڑی اینٹی بائیوٹک اور دنیا کا سب سے بڑا ملٹی وٹامن ہے۔ آپ اپنے اندر صرف برداشت کی قوت پیدا کر لیں تو آپ کو ایمان کے سوا کسی دوسری طاقت کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ انسان اکثر اوقات ایک گالی برداشت کر کے سینکڑوں ہزاروں گالیوں سے بچ سکتا ہے اور ایک بری نظر کو اگنور کر کے دنیا بھر کی غلیظ نظروں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ آج کے بعد آپ کو جب بھی غصہ آئے تو فوراً اپنے ذہن میں اللہ کے رسول ﷺ کے یہ الفاظ لے آئیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا ''غصہ نہ کیا کرو' مجھے یقین ہے اللہ کے رسول ﷺ کے یہ الفاظ آپ کی قوت برداشت میں اضافہ فرما دیں گے۔

یزید بن بابنوس بیان کرتے ہیں کہ ہم نے پوچھا حضرت عائشہؓ سے کہ حضور ﷺ کے اخلاق کیسے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق عین قرآن تھے۔ پھر فرمانے لگیں کہ سورۃ المومنون سناؤ۔ اس کی ابتدائی آیات (جن میں مومنوں کی صفات کا ذکر ہے) سن کر فرمایا یہی رسول اللہ کے اخلاق فاضلہ تھے۔

اقتصادی راہداری کا منصوبہ

امجد مرزا امجد

اقتصادی راہداری کا منصوبہ دنیا کا سب سے بڑا معاشی پراجیکٹ ہے!

یہ ہزاروں کلومیٹر ریلویز، موٹرویز، لاجسٹک سائٹس اور بندرگاہوں کا ایک مربوط نظام ہے۔ چین ہر روز 60 لاکھ بیرل تیل باہر سے منگواتا ہے جس کا سفر 12000 کلومیٹر بنتا ہے جبکہ یہی سفر گوادر سے صرف 3000 کلومیٹر رہ جائیگا۔ گوادر پورٹ آبنائے ہرمز پر دنیا کی سب سے گہری بندرگاہ ہے۔ مصر کی نہر سویز سے پورے یورپ کے لیے روزانہ 40 لاکھ بیرل تیل جاتا ہے جبکہ گوادر سے صرف چین کے لیے روزانہ 60 لاکھ بیرل تیل جائیگا۔ چائنہ کو سالانہ 20 ارب ڈالر بچت صرف تیل کی درآمد میں ہوگی جبکہ پاکستان کو تیل کی راہداری کی مد میں 5 ارب ڈالر سالانہ ملیں گے۔

سب سے بڑھ کر چین امریکہ اور انڈیا کی محتاجی سے نکل آئیگا جو اس وقت چین جانے والے سمندری راستوں کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ صرف اسی بات سے امریکہ اور انڈیا کو موت پڑ رہی ہے۔ ایشیا اور افریقہ دنیا کی سب سے بڑی مارکیٹ ہیں جبکہ یورپ صرف 13 فیصد بنتا ہے دنیا کی کل آبادی کا۔ روس اپنی تجارت اس خطے میں کرنا چاہتا ہے اس کے لیے روس کے پاس صرف دو ہی راستے ہیں ایران کی چاہ بہار بندرگاہ جسکی گہرائی 11 میٹر سے زیادہ نہیں جبکہ دوسرا راستہ گوادر کا ہے جو دنیا کی تیسری سب سے گہری بندرگاہ ہے۔ سنٹرل ایشیاء کی ریاستیں دنیا کا دوسرا سب سے بڑا تیل اور گیس کا ذخیرہ رکھتی ہیں۔ جن کو وہ ان ممالک تک پہنچانا چاہتے ہین. روس اور وسطی ایشائی ممالک گوادر کی بدولت بہت جلد پاکستان پر انحصار کرینگے۔

ایک اندازے کے مطابق 80 ہزار ٹرک روزانہ چین، روس اور سنٹرل ایشیاء کے ممالک سے گوادر کی طرف آمدورفت کرینگے۔ پاکستان کو صرف ٹول پلازے کی مد میں ہی 20 سے 25 ارب کی بچت ہوگی۔ معاشی راہداری کے قریب بہت بڑے انرجی زون بنیں اور وہاں کام کرنے کے لیے چین سے زیادہ سستی افرادی قوت میسر ہوگی۔ اور تو اور اتنے لمبے روٹس پر صرف کینٹین، ٹائر پنکچر اور ڈسپنسری وغیرہ کی مد میں ہی ہزاروں پاکستانیوں کو روزگار مل جائیگا۔ اللہ نے پاکستان کو جو سٹریٹیجک پوزیشن دی ہے وہ اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ پاکستان پوری دنیا کی تیل، گیس اور ایگریکلچرل، صنعتی ومعدنی پیداوار اور منڈیوں کے درمیان پل بن چکا ہے۔ جو لوکیشن پاکستان کو میسر ہے قومیں اسکا خواب دیکھتی ہیں۔ ہمارے دشمن اس منصوبے کو روکنے کے لیے سب کچھ کرینگے۔

کائنات اور ہم

ثقلین مبارک

کائنات میں ہمیں ان گنت چیزیں، مناظر اور کرشمے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک راز سورج کے ساتھ سورج مکھی کے پھول کے لگاؤ کا بھی ہے۔ یہ پھول دن بھر افق پر چمکنے والے سورج کے اشاروں پر چلتا ہے اور ہمیشہ سورج کے ساتھ اپنا رخ تبدیل کرتا ہے۔ اس بات کو لے کر سائنس دان حیران تھے کہ کیوں سورج مکھی کا پودا ہر روز اُبھرتے سورج کے ساتھ سارا دن اس کی روشنی کا پیچھا کرتا ہے اور شام میں سورج کی آخری جھلک پانے کے لیے پوری طرح سے اپنا رُخ مغرب کی سمت موڑ لیتا ہے۔ جبکہ رات میں سورج کی غیر موجودگی میں یہ پھول واپس مشرق کی سمت میں اپنا رخ موڑے رکھتا ہے اور سورج کی واپسی کا انتظار کرتا ہے اور بالغ یا بڑا پھول بننے تک ایسا کرتا ہے۔ لیکن سورج مکھی کے پودے یہ کس طرح کرتے ہیں یہ اب تک ایک راز ہی رہا ہے۔ بالآخر علم نباتات کے ماہرین نے اس بات کا جواب بھی ڈھونڈ نکالا ہے جن کا کہنا ہے کہ یہ سورج مکھی کے پھول کی سورج کے ساتھ محبت کا معاملہ نہیں ہے بلکہ 'ہیلیو ٹروپزم' یا کسی پودے کی نشوونما کے دوران اس پر پڑنے والی سورج کی روشنی سے متاثر ہونے کا رُجحان ہے۔

تاہم ماہرین یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیوں سورج مکھی کا نیا پھول سورج کا پیچھا کرتا ہے اور کیوں بالغ پودا بن جانے پر سورج مکھی کا پھول سورج کی پیروی کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ محققین نے ظاہر کیا کہ جب سورج مکھی پودا مکمل طور پر نمو پا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں انسانوں کے قد جتنا لمبا ہو جاتا ہے تو سورج کے رخ پر حرکت کرنا بند کر دیتا ہے اور زیرہ پاشی کرنے والے کیڑوں کو متوجہ کرنے کے لیے اپنا رخ ہمیشہ مشرق کی طرف رکھتا ہے۔ تحقیقی جریدے 'سائنس' میں شائع ہونے والی تحقیق میں سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ سورج مکھی کے پھول کی اندرونی گھڑی سرکیڈین ردھم اور روشنی کا پتہ لگانے کی صلاحیت مل کر کام کرتی ہے اور نشوونما سے متعلق جینز کو صبح کے وقت میں سورج کے رخ کے ساتھ جھکنے کی اجازت دیتی ہے۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا ڈیوس میں پلانٹ حیاتیات کے شعبے سے وابستہ محققین پروفیسر اسٹیسی ہارمر اور پروفیسر ہائیگو پ ایٹ ایمین اور ان کی ٹیم نے کھیتوں، گملوں اور نمو کے چیمبر میں سورج مکھی پر اپنا مطالعہ مکمل کیا ہے۔ سائنس دانوں کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ سورج کی روشنی کا پیچھا کرنے کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے لہذا تجربات کے ایک سلسلہ میں انھوں نے بیرونی گملوں میں سورج مکھی کے پودوں کو باندھ کر سورج کی روشنی سے باخبر رہنے سے روکا۔ نتیجے کے طور پر یہ پودے سورج کے رخ پر مڑنے والے سورج

مکھی کے پودوں کے مقابلے میں کم بڑھے تھے اس کا صاف مطلب تھا کہ سورج کی ٹریکنگ نے پودوں کی نشوونما کو فروغ دیا تھا۔ دوسری طرف ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ سورج مکھی کا پودا رات میں اپنی سمت تبدیل کرتا ہے۔

کھلا تضاد

کیا یہ توہین رسالت نہیں ہے کہ ہم سردیوں کے آتے ہی کافروں اور گوروں اور غیر مسلموں کے اُترے کپڑے لینے کیلئے دوڑ پڑتے ہیں لیکن اپنے ملک میں غیر مسلموں، مسیحیوں سے ہاتھ ملانا گوارا نہیں کرتے اور اُن کے لئے اپنے برتن دینا معیوب سمجھتے ہیں کیا یہ کھلا تضاد نہیں۔

ہائے یہ مسلمان - اعزاز لطیف خان

ایک مسلمان سے بغض رکھنے والے شخص کو کوئی ایسا مرض ہو گیا جس کے لئے ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا۔ آپریشن سے پہلے ''مسلمان الرازی'' کے بتائے گئے طریقہ کے مطابق بیہوش کیا گیا۔ پھر اس کی کاٹ پیٹ یعنی سرجری کی گئی اور جن آلات سے کی وہ دونوں یعنی سرجری اور آلات جراحی ابوالقاسم الزبوری (مسلمان) نے صدیوں پہلے ایجاد متعارف ورائج کئے۔ پھر اسی ''الزبوری'' (مسلمان) کے ایجاد کردہ قابل تحلیل ٹانکوں سے ملحد کھلی ہوئی چیری ہوئی پھٹی ہوئی جگہ کو سیا گیا۔ پھر اسی مسلمان کی ایجاد کردہ ڈرپ کے ذریعہ (ابن سینا مسلمان) کی متعارف کردہ موجودہ ایجاد ادویات کی تکنیک سے بنائی گئی دوائی) اس ڈرپ میں ایک (ترک مسلمان) کی ایجاد کردہ سرنج کے ذریعہ (یعقوب الکندی مسلمان) کی بتائی ہوئی مقدار کے مطابق انجیکٹ کی گئی تا کہ اس کی وہ جگہ جلد ٹھیک ہو جائے۔ وہ شخص جب ہوش میں آیا تو اسے شدید درد ہوا۔ وہ جگہ پکڑ کر رونے لگا اس کی آواز سن کر ایک نرس بھاگی ہوئی آئی اور اسے ایک پین کلر کیپسول نگلنے کو کہا۔ ملحد کیپسول نگلنے کے بعد، سسٹر جب یہ کیپسول پیٹ میں جاتا ہے تو اس کے خول کا کیا ہوتا ہے؟ نرس سر یہ خول پیٹ میں جا کر تحلیل ہو جاتا ہے گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ شخص واہ کیا بہترین ایجاد ہے۔

تمام انسانیت اس کے موجد کی قرض دار ہے۔ نرس جی یہ ابو القاسم الزبوری مسلمان کی ایجاد ہے۔ وہ شخص نکمے مسلمان یہ بھی کوئی ایجاد ہوئی جاہل عرب بدو مغرب مریخ پر پہنچ گیا اور یہ کیپسول میں اٹکا ہے۔ نرس سر یہ صدیوں پہلے اُس وقت کی ایجاد ہے جب اہلیان مغرب نہانے کو کفر سمجھا کرتے تھے۔ اچھا اچھا آپ ملاؤں کی وکالت چھوڑیں میری فیملی لیپ ٹاپ دی گئی ہوگی۔ مجھے لا دیں۔ نرس۔ لیپ ٹاپ دیتے ہوئے اسے سران کمپیوٹر میں بنیادی حیثیت رکھنے والی Bios استعمال ہوتی ہے جو کہ موسیٰ الخوارزمی (مسلمان) کی ایجاد ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلکولیٹر موبائیل یا کمپیوٹر غرض ہر خود کار ایجاد میں اس ہی ''مولوی'' کی وجہ سے ہے۔ انکل جاؤ یہاں سے۔

نرس کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک نرس کی پیٹھ پیچھے اس کے خلاف زیر لب آزادی اظہار رائے کرتا رہا۔ اور کچھ دیر بعد اس نے لیپ ٹاپ کھول کر فیس بک پر سٹیٹس ٹھوکا ''جدید دنیا میں سائنس میں مسلمانوں کا حصہ صفر ہے۔ پوسٹ کرتے ہی کمنٹ بھی آ گیا۔ یہ صفر بھی موسیٰ الخوارزمی مسلمان) کی ایجاد ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتا نرس نے کمینٹ کر دیا۔ ہن چنگے رہے ہو ملحد، تم جاہل تم بدو تم گنوار۔

پاکستان کے علمائے سو کے کرتوت

شیراز وحید خان

کیا آپ یقین کریں گے؟ کہ ترقی اور روشنی کے اس دور میں دنیا میں ایک ایسا ملک بھی ہے جہاں احمدی مسلمانوں کو جو ایک خدا اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفی ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے اور آنحضرت ﷺ پر رات دن درود بھیجتے ہیں غیر مسلم قرار دے رکھا ہے۔ جہاں اگر خود کو مسلمان کہیں اپنی مسجد کو ''مسجد'' کے نام سے یاد کریں یا اذان دیں تو تین سال کی سزا دی جاتی ہے۔ جہاں جب ایک احمدی عدالت میں ضمانت کے لئے جاتا ہے تو ملاؤں کا ہجوم اس پر پل پڑتا ہے اسے پتھر مار کا شہید کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کی لاش کو شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گھسیٹا جاتا ہے۔ پولیس تماشائی بنی یہ سب کچھ فلم دیکھ کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اخبارات میں اس سانحہ کی تشہیر ہوتی ہے مگر کسی سیاست دان، حکومت کے کارندے یا عدلیہ کو اس کی مذمت کی توفیق نہیں ہوتی۔ جہاں توہین رسالت کے جھوٹے الزامات کی بنا پر احمدی مسلمانوں کو مقدمات میں الجھایا جاتا ہے پھر عدالت کے باہر غنڈہ گردی کا مظاہرہ کر کے ان کی ضمانتیں نہیں ہونے دی جاتیں۔ جہاں ملک کی سپریم کورٹ یہ فیصلہ دیتی ہے کہ احمدیوں کا اسلام سے کسی طرح کی وابستگی کا اظہار توہین رسالت کی دفعہ کے تحت جرم عظیم ہے جس کی سزا موت ہے۔ جہاں اس وقت 200 کے لگ بھگ احمدیوں پر توہین رسالت کی دفعہ کے تحت جھوٹے مقدمات درج ہیں۔ جہاں احمدی مسلمان کو جس نے یہ کہا کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کا ظہور وہ چکا ہے۔ 13 سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ جہاں ایک احمدی مسلمان کو السلام علیکم کہنے کے جرم میں چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ جہاں ایک احمدی مسلمان کو نماز پڑھنے کے جرم میں عدالت نے سزا دی۔ جہاں احمدی مساجد پر دن دہاڑے پولیس کی موجودگی میں حملے ہوتے ہیں اور اُن کو مسمار کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت تک 9 احمدی مساجد مکمل طور پر تباہ کر دی گئی ہیں اور 17 مساجد کو حکومت نے سر

بھر کر دیا تا کہ احمدی مسلمان ان میں نماز نہ ادا کر سکیں۔ جہاں پولیس افسران کو خبردار کرنے کے باوجود مسلح غنڈے احمدی گھروں پر دن دہاڑے حملہ کرتے ہیں ان کو گھروں میں بھاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کا سامان لوٹ لیتے ہیں اور پھر مکانوں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ گھر کی حفاظت کرنے والوں پر گولیاں برسائی جاتی ہیں اور بعض جگہ بچوں تک کو شہید کر دیا جاتا ہے۔ جہاں احمدی مسلمانوں کا قیام احمدیت پر ایک سو سال پورے ہونے پر بچوں میں مٹھائیاں بانٹنا، گھروں اور مسجدوں کو روشنیوں سے منور کیا جاتا ہے، غرباء اور یتامی میں کھانا تقسیم کرنا جرم بن جاتا اور پولیس ایسا کرنے والے احمدی مسلمان کو گرفتار کرنے کیلئے سارے شہر میں دوڑی پھرتی ہے۔ جہاں احمدی مسلمان اپنے آباد کردہ شہر ربوہ میں کھیلوں کے ٹورنامنٹ بھی منعقد نہیں کر سکتے۔ جہاں ایک احمدی مسلمان کی عام روزمرہ کی زندگی آئین کی لحاظ سے ایک بہت بڑا جرم بن گئی ہے۔ ایسا بدقسمت ملک ملک پاکستان ہے۔

جدوجہد آزادی کشمیر کے ایک گمنام بانی اور قائد

خواجہ غلام نبی گلکار انور صاحب

محمد حسین شاہد

خواجہ غلام نبی صاحب گلکار انور ایک مخلص احمدی اور تحریک آزاد کشمیر کے بانی کارکنوں اور قائدین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ مارچ 1909ء میں سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ 12 سال کی عمر ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ہوش سنبھالنے پر شہر کے ایک دینی مدرسہ میں قرآن مجید پڑھا پھر اسلامیہ ہائی سکول اور بعد ازاں (سری پرتاپ ہائی سکول سرینگر) میں تعلیم حاصل کی اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد لاہور گئے اور اشاعت اسلام کالج میں قرآن مجید اور احادیث کے درس میں شرکت کی۔ ایس پی کالج سرینگر سے آپ نے ایف اے اُس وقت کیا جب آپ اپنے ہم وطنوں کی آزادی اور انسانی حقوق کی بحالی کی جدوجہد میں حصہ لینے کی پاداش میں جیل میں تھے۔ بی اے کا امتحان بھی آپ نے سنٹرل جیل سرینگر سے دیا۔ آپ اپنے خاندان میں پہلے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔

(معمار ملت مؤلفہ قریشی محمد اسد اللہ صاحب کاشمیری)

سیاسی زندگی کا آغاز

1929ء میں حضرت امام جماعت احمدیہ کشمیر تشریف لے گئے تو گلکار صاحب کو بھی آپ کی مجلس سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ ملک وقوم کی خدمت کی چنگاری طالب علمی کے زمانہ ہی سے آپ کے اندر دبی ہوئی تھی حضور کی توجہ سے اب سلگنے لگی اور انہوں نے 1930ء کے آغاز میں مختلف پبلک مقامات پر جا جا کر اصلاحی تقاریر کا سلسلہ شروع کر دیا اور ان میں حضرت امام جماعت احمدیہ کی نصائح کے پیش نظر تعلیم اتحاد اور معاشرتی رسم ورواج کی اصلاح پر زور دینے لگے۔

ان دنوں کشمیر میں کوئی انجمن بنانا یا سیاسی جلسہ کرنا تو قانوناً جرم تھا آپ نے مسجدوں، خانقاہوں، میلوں اور اسی نوعیت کے دیگر اجتماعات میں جا کر تقاریر کر کے اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنیکی کوشش کی۔ ایس پی کالج میں تعلیم کے دوران آپ نے اپنے چند دیگر ساتھیوں کے تعاون سے ''کشمیر مسلم سوشل اپ لفٹ ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے آپ پہلے صدر بنے انہی دنوں شیخ عبداللہ علی گڑھ سے ایم ایس سی کر کے وطن واپس آئے اور سٹیٹ ہائی سکول سرینگر میں سائنس ٹیچر مقرر ہوئے اس وقت سے شیخ عبداللہ اور گلکار صاحب نے مل کر کشمیریوں کی آزادی کیلئے کام کرنا شروع کیا۔ انہی کی کوششوں سے سرینگر میں ''فتح کدل ریڈنگ روم'' قائم ہوا اس ریڈنگ روم نے کشمیر میں آزادی کی رُوح پھونکنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس مناسبت سے بعد میں فتح کدل ریڈنگ روم پارٹی وجود میں آئی۔ شیخ عبداللہ اس کے صدر اور خواجہ غلام نبی گلکار جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ریڈنگ روم پارٹی اور کشمیر مسلم سوشل اپ لفٹ ایسوسی ایشن کی کوششوں اور سرگرمیوں کے نتیجہ میں ریاست میں اندر ہی اندر انقلاب کا لاوا پکتا رہا۔ انہی ایام میں مہاراجہ ہری سنگھ دورہ یورپ سے کشمیر واپس آئے تو جہاں سرکاری سطح پر ان کے شاندار استقبال کی تیاریاں کی گئیں وہاں ریڈنگ روم پارٹی نے راتوں رات سرخ سیاہی سے قلمی پوسٹر لکھ کر شہر کے مرکزی مقامات پر چسپاں کئے جن میں کشمیری عوام کی حق تلفیوں کا ذکر کر کے شہری آزادیوں کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا پارٹی نے اس سلسلہ میں جامع مسجد سرینگر میں پبلک جلسہ بلایا۔ ریڈنگ روم پارٹی نے گلکار صاحب کو پہلا ''ڈکٹیٹر'' مقرر کیا۔ چنانچہ آپ نے جراءت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جامع مسجد میں جلسہ منعقد کیا اور پرجوش تقریر کی۔ اس جلسہ میں شرکت کرنے والے ہزاروں عوام نے اپنے لیڈروں کو ان کی خدمات کی بناء پر مختلف خطابات سے نوازا۔ چنانچہ شیخ عبداللہ کو ''شیر کشمیر'' اور خواجہ غلام نبی گلکار کو ''معمار ملت'' کا خطاب دیا گیا اس کے بعد شیخ عبداللہ پبلک جلسوں میں برملا کہا کرتے تھے کہ خواجہ غلام نبی گلکار شیر دل نوجوان نے تحریک آزادی کشمیر کی بنیاد ڈالی ہے اور ہم نے اُسے چلا دیا ہے۔

(''معمار ملت'' مؤلفہ قریشی محمد اسد اللہ کاشمیری سے ماخوذ)

قید و بند کی صعوبتیں

1931ء میں ہی 13 جولائی کو سنٹرل جیل سرینگر کے باہر جمع مسلمانوں کیا یک بڑے مجمع پر ڈوگرہ فوج نے اندھا دُھند گولیاں برسائیں جس سے سرکاری اعلامیہ کے مطابق 10 (غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق اس) سے کہیں زیادہ افراد شہید ہوئے اس واقعہ کے بعد پورے شہر میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کے دوران ڈوگرہ پولیس فوج اور ہندبلوائیوں نے مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کو لوٹا اور مسلمانوں پر شرمناک مظالم ڈھائے۔

گرفتار ہونے والے کشمیری نوجوانوں میں شیخ عبداللہ اور خواجہ غلام نبی اگلکار بھی شامل تھے، چنانچہ ہتھکڑیاں لگے ان قیدیوں کو جب ''ہری پربت قلعہ'' لے جایا گیا تو انہیں ایک ایک کر کے تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں جانے کا حکم دیا گیا چنانچہ سب سے پہلے گلکار صاحب نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کوٹھڑیوں میں جانے کیلئے اپنے آپ کو پیش کیا اور یوں آپ ''قلعہ ہری پربت کے پہلے قیدی'' کہلائے ان قیدیوں کی رہائی کے لئے کشمیر میں 19 دن احتجاجی ہڑتال رہی جس کی وجہ سے بالآخر حکومت کو کچھ عرصہ بعد قیدیوں کو مجبوراً جیل سے رہا کرنا پڑا۔

24 ستمبر 1931ء کو شیخ عبداللہ پھر گرفتار ہوئے تو اس موقع پر مظاہرہ کیا گیا جس کے رُوح رواں گلکار صاحب تھے۔ گلکار صاحب نے کشمیر کے تمام لوہاروں کو راتوں رات ہتھیار تیار کرنے اور پبلک رضا کاروں اور عوام کو اگلے روز ہتھیار بند ہو کر پریڈ کرنے کا حکم دیا چنانچہ سرینگر اور اس کے مضافات میں تقریباً ایک لاکھ مسلح رضا کاروں نے صبح سے شام تک کھلے بندوں پریڈ میں حصہ لیا۔ اگرچہ ڈوگرہ پولیس یا فوج نے کوئی مزاحمت کرنیکی جرأت نہ کی تاہم ان حالات کے پس منظر میں ڈوگرہ حکومت نے ریاست میں مارشل لاء نافذ کر دیا جس کے بعد لوگوں کو گرفتار کر کے انتہائی سخت سزائیں دی گئیں۔ گلکار صاحب کی گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا مگر آپ کسی نہ کسی طرح بچ بچا کر کشمیر سے نکل کر لاہور پہنچے جہاں آپ نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر امام جماعت احمدیہ مرزا بشیر الدین محمود احمد سے ملاقات کی اور آپ کو کشمیر کے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ حضرت امام جماعت احمدیہ نے فوری طور پر وائسرائے ہند سے رابطہ کر کے حکومت ہند سے کشمیر میں مداخلت کرائی اور یوں تمام اسیروں کو رہائی ملی۔ اسیری کی زندگی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1931ء تک ڈوگرہ حکومت نے گلکار صاحب کو چھ بار قید کیا جس کے دوران آپ کو کافی صعوبتیں اور تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ پانچ بار شیخ عبداللہ کے ساتھ جیل میں رہے اور چھٹی بار آپ تن تنہا 13 ماہ تک جیل میں رہے۔ حکمرانوں کے تمام تر مخالفانہ اور جابرانہ ہتھکنڈوں کے باوجود ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے جموں وکشمیر قانون ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ مسلمانان کشمیر کی نمائندگی۔ جون 1944ء میں حکومت کشمیر کی طرف سے سرگنگا ناتھ چیف جسٹس کشمیر کی زیر صدارت ایک شاہی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا تا ریاست کا آئندہ آئین ونظام اس طرز پر ڈھالا جا سکے کہ ریاست کے مختلف فرقے یکساں طور پر زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کر سکیں۔ اس کمیشن میں مسلمانان کشمیر کی نمائندگی خواجہ غلام نبی صاحب گلکار جنرل سیکرٹری مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کے علاوہ چوہدری عبدالواحد صاحب مدیر اعلیٰ ''اصلاح'' سرینگر و امیر عبدالرحمان صاحب جماعت ہائے احمدیہ کشمیر اور خواجہ عبدالرحمٰن ڈار سرپنچ پنچائت ناسنور نے کی۔ قائداعظم سے ملاقات۔ وسط 1944ء میں قائداعظم محمد علی جناح کشمیر میں قیام پذیر تھے۔ انہی ایام میں ایسوسی ایشن کا ایک وفد جو خواجہ غلام نبی صاحب گلکار اور خواجہ عبدالغفار صاحب ڈار مدیر ''اصلاح'' سرینگر پر مشتمل تھا۔

19 مئی 1944ء کو قائداعظم سے اُن کی رہائش گاہ پر ملا اور سیاست کشمیر پر گفتگو کی۔ خواجہ صاحب گلکار کے بیان کے مطابق دوسرے روز چوہدری غلام عباس خان صاحب اور مسلم کانفرنس کے دوسرے کارکنوں نے بتایا کہ قائداعظم آپ (یعنی گلکار صاحب) کی بہت تعریف کرتے تھے اور ان کی نظر کشمیر کی لیڈرشپ کیلئے آپ پر لگی ہوئی ہے۔

آزاد کشمیر کے پہلے صدر

مولانا دوست محمد صاحب مؤرخ احمدیت لکھتے ہیں۔

''عارضی جمہوریہ کشمیر کے پہلے صدر خواجہ غلام نبی صاحب گلکار اور پرائم منسٹر سردار محمد ابراہیم خان صاحب تھے۔ یہ اعلان 5.4 اکتوبر 1947ء کو ریڈیو مظفر آباد سے کیا گیا اور ہری سنگھ مہاراجہ جموں وکشمیر کی معزولی کا اعلان بھی کیا گیا۔ اگلے روز یہ اعلان پاکستان ٹائمز سول اینڈ ملٹری گزٹ وغیرہ اخبارات میں کیا گیا۔ ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ خواجہ غلام نبی گلکار کو سرینگر روانہ کیا جائے۔ 8۔ اکتوبر کو آپ نے سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ صاحب سے ملاقات کی۔ 7 تا 22 اکتوبر 1947ء 15 یوم میں انڈر گراؤنڈ کیبنٹ کے ارکان کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ گلکار صاحب کو 14 دسمبر 1947 گرفتار کیا گیا۔ حکومت آزاد کشمیر کی بنیاد 4 اکتوبر 1947ء کو پڑی تھی اور آپ اس کے پہلے صدر تھے آپ کی گرفتاری کے بعد نئی حکومت کی تشکیل نو سردار محمد ابراہیم نے 1950ء میں کی۔ آپ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کے سلسلہ میں گلگت کے ایڈمنسٹریٹر بریگیڈئر گنسارا سنگھ کے تبادلہ میں پاکستان آئے اور آپ نے راولپنڈی میں قیام کیا۔ 1952ء میں آپ نے ''ہمارا کشمیر'' کے نام سے ایک ہفت وہ رسالہ

نکالا۔ جسے 1955ء میں حکومت نے بند کر دیا۔آپ نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔مگر اپنی ضمیر کی آواز پر کبھی سودے بازی نہیں کی۔آپ کشمیر کی آزادی کیلئے ایک دردمند دل رکھتے تھے۔آپ ایک مخلص اور فدائی احمدی تھے۔ 17 جولائی 1973ء کو راولپنڈی میں آپ کی وفات ہوئی۔

حکومت آزاد کشمیر کی بنیاد اور جماعت احمدیہ

تقسیم ہند کے وقت پورے کشمیر کو آزاد کرانے کی خاطر حضرت امام جماعت احمدیہ نے رتن باغ لاہور میں کشمیری لیڈروں کی کانفرنس بلوائی اور کہا کہ یہ وقت کشمیریوں کی آزادی کا ہے۔مفتی اعظم ضیاء الدین صاحب کو صدر جمہوریہ کشمیر بننے کو کہا گیا مگر انہوں نے انکار کیا پھر ایک نوجوان قادری صاحب سے کہا گیا۔انہوں نے بھی انکار کر دیا۔آخر میں قرعہ خواجہ غلام نبی صاحب گلکار انور کے نام پڑا۔ گلکار انور نے 14 اکتوبر 1947ء سے بانی صدر ''عارضی جمہوریہ حکومت کشمیر کی معزولی مہاراجہ کشمیر'' کے نام سے ہری سنگھ مہاراجہ کی معزولی کا اعلان کر دیا۔اس کے بعد کشمیر میں بائیس حکومتیں بنیں۔پہلی گورنمنٹ کا ذکر ریڈیو پاکستان پر بھی نشر ہوا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ اور دیگر اخبارات میں اس کا ذکر ملتا ہے۔بلقیس تاثیر اپنی انگریزی کتاب ''کشمیر شیخ عبداللہ کا'' میں صفحہ 318 پر لکھتی ہیں۔یعنی پہلی آزاد کشمیر گورنمنٹ کا قیام خواجہ غلام نبی گلکار نے 14 اکتوبر 1947ء کو کیا۔

احمد گل صاحب کوثر مدیر اخبار ''ہمارا کشمیر'' (مظفر آباد) لکھتے ہیں۔''عارضی جمہوریہ حکومت کشمیر'' نام سے ہری سنگھ کی معزولی کا اعلان ہوا۔خواجہ غلام نبی گلکار انور صاحب نے یہ تار راولپنڈی صدر تار گھر سے غالباً چالیس روپیہ دیکر دے دیا۔یہ تار ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات کے علاوہ اے پی پی آئی کو دیا گیا۔راولپنڈی میں اس وقت اے پی پی کا کوئی نمائندہ نہیں تھا۔مسٹر بشارت ''پاکستان ٹائمز'' کے نمائندے تھے۔اعلان کے بعد 5 تاریخ کو راقم الحروف خواجہ غلام نبی گلکار انور اور بشارت صاحب نے باجازت باقی ممبران کیبنٹ سردار محمد ابراہیم خان صاحب پرائم منسٹر عارضی جمہوریہ حکومت کشمیر کا بیان تیار کر کے شائع کر دیا جو اخبارات میں چھپ گیا۔غلام نبی گلکار انور صاحب کے بیان میں واضح کر دیا گیا کہ 14 اکتوبر 1947ء ایک بجے رات کے بعد ہری سنگھ کی معزولی کے ساتھ ''عارضی جمہوریہ حکومت کشمیر'' کا قیام بمقام مظفر آباد عمل میں لایا گیا۔اور انور اس حکومت کا صدر ہے۔ 14 اکتوبر 1947ء کو بمقام پیرس ہوٹل راولپنڈی حسب ذیل وزیر اور عہدہ دار مقرر ہوئے چونکہ معاملہ عارضی تھا اور کسی کو کیا گمان تھا کہ یہ حقیقت بن کر رہے گا۔مگر دل سے جو آواز نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

صدر ''عارضی جمہوریہ حکومت کشمیر'' خواجہ غلام نبی صاحب گلکار انور۔پرائم منسٹر سردار محمد ابراہیم خان صاحب بمشورہ مولوی غلام حیدر صاحب جنڈالوی (سردار ابراہیم خان صاحب میٹنگ میں موجود نہ تھے وزیر مالیات سید نذیر حسین شاہ، وزیر دفاع۔مولوی غلام حیدر جنڈالوی ،چیف پبلسٹی آفیسر گل احمد خان کوثر (راقم الحروف) میٹنگ میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ خواجہ انور صاحب کو سرینگر فوراً روانہ کر دیا جائے اور انہیں مکمل اختیار دیدیا گیا کہ وہ جنہیں مناسب سمجھیں انڈر گراؤنڈ گورنمنٹ میں وزیر یا عہدیدار بنالیں۔چنانچہ ریڈیو سے '4.5 اکتوبر 1947ء کو' پے در پے 'عارضی جمہوریہ حکومت کشمیر'' کے قیام کا اعلان بمقام مظفر آباد ہوتا رہا۔خواجہ انور بانی صدر 16 اکتوبر کو راولپنڈی سے روانہ ہوئے اسی روز انہیں مسٹر عبدالرحیم درانی دومیل پل کے پاس ملے تو انہیں ڈیفنس سیکرٹری مقرر کر کے کشمیر چھوڑنے کو کہا۔خواجہ غلام دین صاحب وانی کو بھی مظفر آباد چھوڑنے کو کہا اور ان دونوں صاحبان کو فوری لاہور مرزا صاحب کے پاس جانے کو کہا گیا۔14 اکتوبر 1947ء کو یہ فیصلہ بھی ہوا تھا کہ وزیر مالیات سید نذیر حسین شاہ صاحب، وزیر دفاع مولوی غلام حیدر صاحب جنڈالوی ،راقم الحروف اور دیگر لیڈران تحریک جناب مرزا صاحب کی خدمت میں لاہور پہنچ جائیں گے اور مشورہ کریں گے کیونکہ اس وقت حالت یہ تھی کہ مغربی پاکستان اور کشمیر کی آزادی دونوں خطرے میں نظر آرہی تھیں اور عارضی حکومت کا اعلان اخبارات میں چھپ چکا تھا۔مگر ان مذکورہ بالا آدمیوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ یہ اعلان کس نے کیا اور کیسے ہوا؟

شیخ محمد عبداللہ کی قائداعظم سے ملاقات کی تجویز

خواجہ غلام نبی گلکار انور صاحب بانی صدر 18 اکتوبر 1947ء کو شیخ عبداللہ صاحب کے مکان واقع سودرہ سرینگر پر ملے۔اڑھائی گھنٹے باتیں ہوئیں۔آخر میں یہ طے پایا کہ ان کے اور قائداعظم کے درمیان ملاقات کا بندوبست کر دیا جائے۔17 اکتوبر 1947ء سے لیکر 22 اکتوبر تک گویا 15 یوم کے عرصہ میں چھان بین کر کے وزراء اور عہدیدار مقرر ہوئے۔(آگے وزراء کے نام ہیں) سردار گل احمد خان صاحب کے مندرجہ بالا بیان کی تائید و تصدیق متعدد ذرائع سے ہوتی ہے۔چنانچہ مسٹر ریڈی نے انہی دنوں پاکستان سے ہندوستان میں پہنچنے کے بعد ''پاکستان کا بھانڈا چوراہے پر'' نامی ایک کتابچہ شائع کیا جس میں لکھا کہ

''آزاد کشمیر کا قیام مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ کے دماغ کا نتیجہ ہے جس کا پروگرام اکتوبر انہوں نے رتن باغ لاہور میں بنایا تھا۔14 اکتوبر 1947ء کو حکومت آزاد کشمیر کا قیام دراصل اس پروگرام کا ابتدائی اقدام تھا۔''

پروفیسر محمد اسحاق صاحب قریشی ایم اے سابق قائم مقام جنرل سیکرٹری مسلم کانفرنس کا بیان ہے۔21 ستمبر 1947ء میں جب مجھے تین سال کے لئے ریاست

بدر کر دیا گیا تو بمقام لاہور وزیر اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان مرحوم نے ایک سیاسی میٹنگ میں مجھے کہا کہ میں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کے ساتھ رابطہ قائم کروں کیونکہ کشمیر کے کام کے سلسلے میں میرے سپرد بحیثیت جنرل سیکرٹری مسلم کانفرنس ایک ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے حضرت صاحب سے رابطہ قائم کیا اور اس سلسلہ میں ان کے ساتھ ستمبر، اکتوبر، نومبر میں تین چار ملاقاتیں پریذیڈنٹ مسلم کانفرنس چودھری حمید اللہ خان کے ساتھ کیں اور اس کے علاوہ تنہا ملاقاتیں بھی کیں۔ میں ذاتی علم کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ امام جماعت احمدیہ، کشمیر کی آزادی کے سلسلہ میں بہت اہم رول ادا کر رہے تھے اور حکومت پاکستان کے وزیر اعظم کی بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سلسلہ میں انہیں حمایت حاصل تھی اور حضرت صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے حکومت کے علم کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ میں متعدد بار حضرت میاں بشیر الدین محمود احمد سے ملا ہوں اور کشمیر کو آزاد کرنے کے سلسلے میں جو تڑپ میں نے ان کے دل میں دیکھی ہے وہ دنیا کے بڑے بڑے محبّ وطنوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ اس موضوع پر میں نے ان کے ساتھ بڑی طویل ملاقاتیں کی ہیں اور میں نے ان جیسی صاف سوچ اور ان جیسا تدبر بہت کم مدبروں میں دیکھا۔ میرا جماعت احمدیہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن میں نے میاں بشیر الدین صاحب کا ان جذبات کیلئے ہمیشہ احترام کیا ہے۔ میں نے اب تک حضرت مرزا صاحب جیسا عالی دماغ مدبر اور آزادی کشمیر میں مخلص کسی کو نہیں دیکھا۔ ستمبر، اکتوبر کو میری ملاقاتوں میں اور اہم سیاسی میٹنگوں میں یہ طے پایا کہ جہاد کشمیر کے آغاز سے پہلے ایک مفصل منشور تیار کر لیا جائے۔ جس کا اعلان جنگی بگل بجنے سے پہلے کر دیا جائے۔ یہ ایک قسم کا سیاسی منشور تھا جس میں جہاد کی غایت اور کشمیر کو فتح کرنے کے بعد نظم ونسق کی تشکیل اور اہل کشمیر کا حق خود ارادیت وغیرہ شامل تھے۔ یہ مسودہ فیض احمد فیض سابق ایڈیٹر پاکستان ٹائمز اور میں نے تیار کیا تھا۔ بعد میں مسودہ میاں بشیر الدین محمود احمد صاحب کو دکھایا انہوں نے اس پر قومی نقطہ نظر سے بعض ترامیم کیں اس کے بعد یہ مسودہ ایک بڑی سیاسی کمیٹی نے منظور کر لیا اور اس کے اعلان کیلئے تاریخ اور وقت کے تعین کا کام اس کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ مگر بعد میں حالات خراب ہو جانے کی وجہ سے اس ترتیب سے جہاد کا کام نہیں ہوا۔ جس ترتیب سے اس منشور میں تجویز کیا گیا تھا۔

مؤرخ کشمیر پریم ناتھ بزاز تاریخ جدوجہد حریت کشمیر صفحہ 621 میں لکھتے ہیں:

''انور غلام نبی گلکار کے سوا کوئی اور نہ تھا جو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر اور تحریک آزادی کا ایک قدیم آزمودہ کار سپاہی ہے جس نے صوبائی انقلابی حکومت آزاد کشمیر کی سرکردگی کی''۔ پھر لکھتے ہیں:

''قبل اس کے کہ مسٹر گلکار، مہاراجہ کو دیکھ بھی سکتے۔ لڑائی پھوٹ پڑی اور صوبائی حکومت کے رئیس اپنے ہیڈ کوارٹرز کو واپس نہ آ سکے اس کے بعد یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ وہ (گلکار صاحب ناقل) دسمبر 1947ء میں گرفتار کر لیے) اور ڈوگرہ حکومت کی طرف سے جیل خانہ میں بھیج دیئے گئے لیکن بغیر یہ علم دیئے کہ وہ آزاد حکومت کا پہلا صدر ہے مسٹر گلکار سری نگر میں مسٹر عبداللہ سے قید ہونے سے پہلے ملے اور ان کے ساتھ گفتگو کی لیکن انہوں نے اس کی شناخت کو ظاہر نہ کیا''۔ مغربی مؤرخ لارڈ برڈ وڈ کی تصدیق۔ مغربی موخ لارڈ برڈ وڈ اپنی کتاب ''دوقومیں اور کشمیر'' میں تحریر کرتے ہیں۔ ''حکومت آزاد کشمیر کی بنیاد 4 اکتوبر 1947ء کو پڑی تھی اور اس کے پہلے صدر خواجہ غلام نبی گلکار تھے اور سردار محمد ابراہیم خان اس حکومت کے پرائم منسٹر تھے جب خواجہ غلام نبی گلکار مظفر آباد سے اندرون کشمیر چلے گئے تو اس کے بعد 24 اکتوبر کو زمام حکومت سردار محمد ابراہیم کے ہاتھ میں آ گئی۔'

(ماخوذ)

سابق ٹیسٹ کرکٹر حنیف محمد۔ لٹل ماسٹر

مکرم قیصر محمود صاحب

ٹیسٹ کرکٹ میں وقت کے لحاظ سے سب سے طویل اننگ کھیلنے والے کھلاڑی حنیف محمد 11۔ اگست 2016ء کو آغا خان ہسپتال کراچی میں 81 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ حنیف محمد نہ صرف پاکستان بلکہ بین الاقوامی سطح پر کرکٹ کا ایک عظیم نام تھا۔ حنیف محمد نے اپنے کرکٹ کیریئر میں اپنی شاندار بیٹنگ سے بیشمار ریکارڈز اپنے نام کئے۔ حنیف محمد 21 دسمبر 1934ء کو انڈیا کے شہر جونا گڑھ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے وقت وہ اپنی فیملی کے ساتھ کراچی شفٹ ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی ابتدائی کرکٹ کا آغاز کیا۔ انہیں پاکستان کی پہلی ٹیسٹ ٹیم کے ممبر ہونے کا بھی اعزاز حاصل تھا۔ 1952-1953ء سے 1969-1970 تک انہوں پاکستان کی طرف سے ٹیسٹ میچز میں نمائندگی کی۔ اور 43.98 کی اوسط سے 3915 رنز اسکور کئے۔ ٹیسٹ کرکٹ میں انہوں نے 12 سنچریاں اور 15 نصف سنچریاں بنائیں اور لاجواب بیٹنگ سے ہر شخص کو متاثر کیا۔

1957-1958ء کے ویسٹ انڈیز ٹور میں باربادوس ٹیسٹ میں جب پاکستان ٹیم فالوآن کا شکار ہو گئی تو دوسری اننگ میں حنیف محمد نے 16 گھنٹے سے زائد (970 منٹ) وکٹ پر گزار کر 337 رنز کی شاندار اننگ کھیلی۔ یہ وہی اننگ تھی جو حنیف محمد کی عالمگیر شہرت کا باعث بنی۔ جس میں انہوں نے وکٹ پر سب سے زیادہ وقت گزارنے کا عالمی ریکارڈ اپنے نام کیا اور پاکستان کی طرف سے سب سے بڑی انفرادی اننگ بھی کھیلی۔ یہ دونوں ریکارڈ بدستور حنیف محمد کے نام ہیں۔ دوسری اننگ

میں ٹرپل سنچری بننے کا اعزاز بھی ایک لمبے عرصہ تک صرف حنیف محمد کے پاس رہا جس میں اب نیوزی لینڈ کے برینڈن میکولم بھی شامل ہو گئے ہیں۔ حنیف محمد نے ایک لمبے عرصہ تک فرسٹ کلاس کرکٹ میں بھی سب سے بڑی اننگ کھیلنے کا اعزاز بھی اپنے نام رکھا۔ انہوں نے 1959-1960 میں کراچی کی طرف سے بہاولپور کے خلاف کھیلتے سرڈان بریڈمین کا، فرسٹ کلاس کا سب سے بڑی اننگ کا انفرادی ریکارڈ 499 رنز بنا کر توڑا۔ یہ انفرادی اننگ کا ریکارڈ 35 سال تک قائم رہا جس کو ویسٹ انڈیز کے شہرہ آفاق کھلاڑی برائن لارا نے اپنے نام کیا۔ حنیف محمد کو 1968ء میں وزڈن کرکٹر آف دا ائرز کا اعزاز حاصل ہوا۔ آئی سی سی نے اب تک جن 55 کرکٹرز کو ہال آف فیم میں شامل کیا ہے اس میں حنیف محمد بھی شامل ہیں۔ 2010ء میں مشہور ویب سائٹ کرک انفو نے آل ٹائم پاکستان ٹیسٹ الیون میں سعید انور کے ساتھ حنیف محمد کو اوپنر کے طور پر چنا۔ حنیف محمد کے علاوہ ان کے تین اور بھائی بھی پاکستان کی طرف سے ٹیسٹ کرکٹ کھیل چکے ہیں۔ جن کے نام وزیر محمد، صادق محمد اور مشتاق محمد ہیں۔ جبکہ ایک اور بھائی رئیس ٹیسٹ میچ میں بارہویں کھلاڑی کے طور پر شامل ہوئے۔ حنیف محمد کے ایک بیٹے شعیب محمد نے پاکستان کی طرف سے ٹیسٹ اور ون ڈے کرکٹ کھیلی جبکہ شعیب محمد کے ایک بیٹے بھی فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل رہے ہیں۔

لٹل ماسٹر کے نام سے معروف حنیف محمد دونوں ہاتھوں سے بالنگ کر لیا کرتے تھے اور وقت پڑنے پر وکٹ کیپنگ کے فرائض بھی سرانجام دے لیا کرتے تھے۔ بعض ماہرین کا یہ خیال ہے کہ کرکٹ میں ریورس سوئپ کے موجد بھی حنیف محمد تھے۔ حنیف محمد کی وفات پر تمام دنیا کے کرکٹرز نے افسوس کا اظہار کیا۔ اوول ٹیسٹ میں پاکستانی کھلاڑیوں کے بازوں پر سیاہ پٹیاں اس افسوس کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ بلاشبہ حنیف محمد ایک ایسے کھلاڑی تھے جنہوں نے ساری زندگی نہایت ایمانداری سے کرکٹ کھیلی اور ہمیشہ کرکٹ کے میدان میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم بلند کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

بی بی آمنہ ؓ فرماتی ہیں

کہ جب آپ ﷺ میرے پیٹ میں آئے تو
ایک بادل کا ٹکڑا آسمان پر وارد ہوا میں جہاں جاتی وہ بادل میرے
اوپر چھاؤں کرتا، میں جب بکریاں چرانے جاتی تو بکریاں میرے پیچھے چلتی،
جب چلتی تو پتھر میرے پاؤں کے نیچے نرم روئی کی طرح ہو جاتے اور جب
کنویں سے پانی نکالنے جاتی تب پانی اوپر چڑھ آتا اور آسانی سے
پانی بھرتی، جب سوتی تو خوبصورت حوریں مجھے پنکھے سے ہوا دیتی،
اور روزانہ ایک نبی مجھے خواب میں مبارک باد دیتے تھے کہ آپکو مبارک ہو
کہ آپ آخری نبی ﷺ کی والدہ ہیں۔

طفیل عامر کی کتاب پر تبصرہ

''دستک سے تھکے ہاتھ''

تعارف۔ امجد مرزا امجد

محترم طفیل عامر صاحب سے پہلی ملاقات ''قندیلِ ادب'' کی جانب سے انہی کے اعزاز میں رکھے گئے مشاعرے میں ہوئی جہاں انہیں سامعین نے خوب جی بھر کے سنا اور محظوظ ہوئے، آپ خوبصورت لب ولہجہ کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ یہ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے اس سے قبل 2010 میں ان کا پہلا مجموعہ کلام ''برفیلی دھوپ'' کے نام سے منظر عام پر آیا جبکہ دوسرا 2012 میں پنجابی میں شعری مجموعہ ''دھوپ کڑاکی'' نے پذیرائی حاصل کی اور پھر 2015 میں ان کا یہ تیسرا شعری مجموعہ ''دستک سے تھکے ہاتھ'' جس کی آج تقریب رونمائی ہے، منصۂ شہود پر آیا۔ جو مجھے میرے بہت ہی محترم دوست بھائی جناب عبدالرزاق رانا صاحب کی وساطت سے بائی پوسٹ ملا اس ہدایت کے ساتھ کہ میں اس پر مضمون لکھوں جو میرے لئے ایک اعزاز ہے کہ میں اتنے خوبصورت شاعر کا تعارفی مضمون لکھوں۔ میرے سب مضامین تعارفی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ میں قطعی اس قابل نہیں کہ کسی شعری مجموعہ کلام پر یا کسی بھی شاعر کی شاعری پر تبصرہ لکھوں۔ اس کام کے لئے ماشاءاللہ برطانیہ میں جگہ جگہ اساتذہ بکھرے پڑے ہیں جو دوسروں کی نوک پلک سنوارنے اور معاف کرنا کیڑے نکالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسا مجھ سے کبھی نہ ہوگا کہ طفیل بھائی کا یہ شعر صادق ہو جائے۔

عامرؔ ہم اُن کی بزم میں تکتے ہی رہ گئے
پُرزے ہماری آرزو کے واں اُڑے تو تھے

شاعر اپنا خون جلا کر صفحہ قرطاس پر دل کی داستاں رقم کرتا ہے کئی جگ رتے کئی دنوں کی مشقت خون پسینے کی کمائی سے ایک کتاب منظر عام پر آتی ہے جسے وہ اپنے دوست احباب کو مفت بانٹتا پھرتا ہے اس امید پر کہ وہ پڑھ کر دو الفاظ حوصلہ افزائی کے دان کریں گے آنکھوں میں محبت کے پھول کھلا کر عزت افزائی کریں گے۔۔ مگر... یقین کیجئے آج چودہ کتابیں لکھ کر بھی میرا وہ حق کوئی بھی ادا نہیں کر سکا جو میں سمجھتا کہ میری اتنی طویل محنت کی کچھ تو کمائی ہوگئی...!! بحر حال... معاف کیجئے۔۔ ہر لکھاری کا درد ایک جیسا ہے۔۔ مگر ہم شاعر مجنوں کی مانند پتھر کھا کر بھی یہ عشق نہیں چھوڑتے۔ اور خاص کر کے جب یہ درد اپنوں سے ہی ملے تو گلہ کس سے۔۔!!

جتنے بھی ملے درد وہ اپنوں نے دیئے تھے
ہم غیروں سے عامرؔ تو ستائے نہ گئے تھے

میرے مضامین کا اکثر پہلا حصہ شاعر کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہوتا ہے مگر افسوس کہ طفیل عامر صاحب سے میری ملاقات کی عمر بہت ہی تھوڑی ہے سوائے سلام دعا سے آگے بات نہ بڑھ پائی۔ البتہ رانا عبدالرزاق صاحب کی تحریر سے اتنا کچھ پتہ چلا کہ جناب پاکستان میں وکالت کے شعبہ سے تعلق رکھتے تھے سابقہ دو عشروں سے برطانیہ میں مقیم ہیں، شاعری کا شوق طویل ہے پہلی غزل زمانہ طالب علمی میں ساٹھ کے عشرے میں لکھی۔ اور شاعری کا یہ عشق ادب سے پیار و محبت تا حال موجود ہے۔ بقول ان کے۔

یہ پیار کیا ہے تجربہ جو میں نے ہے کیا
نعمت ہے یا وبال میرے دل سے پوچھئے

اچھے شاعر کی شاعری بذاتِ خود اس کی تمہید و تعارف ہوتا ہے جو مجھے ان کے اس شعری مجموعہ کلام نے عطا کیا۔ ان کی شاعری نے مجھے ان سے اس طرح متعارف کرایا جیسے میں انہیں صدیوں سے جانتا ہوں۔ شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ ایک فن ایک صناعی ہے۔ شاعر الفاظ کی مدد سے اپنے حسیات و تخیلات جذبوں، ولولوں، امنگوں اور اپنے تجربات و مشاہداتِ زندگی کو تعمیری عمل کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ محترم طفیل عامرؔ صاحب کا شعری اسلوب سب سے منفرد اور نرالا ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری میں جو رنگِ جنوں ہے وہ دوسرے شعراء کے رنگ سخن سے مختلف ہے۔ عشق اور زندگی دونوں سے انہیں لگاؤ جنون کی حد تک ہے۔ ان کی غزلوں میں موضوعات کی فراوانی، شدتِ احساس اور انسانی قدروں کی خصوصیات شامل ہیں۔ خاص کر چھوٹی بحر میں لکھنا اتنا آسان نہیں جبکہ ان کی بے شمار غزلیں چھوٹی بحر میں بڑے بڑے مضامین کو اپنی قبا میں لپیٹے قاری کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔

ذرا الفاظ کا چناؤ ملاحظہ ہو اور شعر کی ساخت دیکھئے۔

نادانی، نادانی میں، بھولا یاد جوانی میں
ذکر نہ اپنا مل پایا، دل کی رام کہانی میں
پھر بھی یہ لب سوکھے تھے، گو میں کھڑا تھا پانی میں
مشکل کا میں عادی تھا، تھی مشکل آسانی میں

لمبی غزل ہے زیادہ وقت نہ لوں گا اسی غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں۔

عامرؔ ہم کو جینا ہے۔ اس فتنہ سامانی میں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر فن کار اپنے عصر کا ترجمان ہوتا ہے۔ باوجود اس کے وہ مقبولیت کی منزل تک یونہی نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کے فن میں توانائی اور سحر کاری کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جسے بغیر ریاضت کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ہمارے شاعر جناب طفیل عامر نے اپنے عصری شعور کو فن کے سانچے میں ڈھالنے میں کتنی ریاضت و مشق کی ہوگی۔ اسی لیے وہ کسی بھی طویل مضمون کو چند الفاظ میں مقید کر کے شعری سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔

بات رہے ادھوری کیوں، نزدیکی ہو دوری کیوں
تیرا صاف ہے دامن تو، کرے جی حضوری کیوں

اور شعر ملاحظہ ہو:

وعدہ جب تُو کرتا ہے، اور پھر کام ضروری کیوں

اور اسی غزل کے مقطع میں کس اعتماد سے کہتے ہیں کہ:

عامرؔ کرنے دیں گے ہم، بات کسی کو پوری کیوں

اب آیئے کچھ ان کی اس خوبصورت کتاب کے بارے میں بات چیت ہو جائے کتاب کا سرورق نہایت خوبصورت چہار رنگا، اسی گرام کے کاغذ پر خوبصورت طباعت ہوئی ہے غالب نما پبلی کیشنز لاہور سے چھاپی گئی یہ کتاب مضبوط مجلد ہے تصور حسین کی کمپوزنگ غلطیوں سے پاک ہے اپنے بھتیجے عامر طفیل کے نام انتساب ہے جس کے ایک فقرے میں ان کی بے پناہ محبت چھلکتی ہے۔ پہلی کتاب دیکھی جس میں انہوں نے کسی کا کوئی مضمون شامل اشاعت نہیں کیا بلکہ اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں لکھا جو یہ ثابت کرتا ہے کہ ان میں خود نمائی کا شائبہ تک نہیں جبکہ آج کل آدھی سے زیادہ کتابیں تعریفی مضامین سے بھری ہوتی ہیں۔ فلیپ پر ان کے ناشر نے چند روائتی جملے ان کی پذیرائی میں ضرور تحریر کئے ہیں۔ ہاں البتہ اس کی ابتداء کسی حمد و نعت سے بھی نہیں کی گئی جو ایک انہونی سی بات لگی۔ ورنہ بیشتر کتب ایک آدھ حمد و نعت سے ہی شروع کی جاتی ہیں۔ مگر برا مت مانیے گا یہ ضرور کہوں گا کہ کم از کم پہلے صفحہ پر فقط بسم اللہ ہی لکھ دیا جاتا کہ بطور مسلمان۔ ہر کام کی ابتدا اللہ کے نام سے تو ہونی ہی چاہیے نا...!!

79 غزلوں سے مزین اس مجموعہ کلام میں جناب طفیل عامر صاحب نے اپنی شاعری میں ان تمام موضوعات کو سمونے کی بھرپور کوشش کی ہے جن کا تعلق عملی سوچ سے بہت گہرا ہے۔ میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ اسی طرح پوری لگن اور سچائی سے اپنی جذبات و احساسات کو سپردِ قلم کرتے رہیں گے اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ اسی طرح لکھتے رہیں گے کیونکہ آپ کا خود کا قول ہے۔

راستے کا انتخاب بھی تو ہم نے خود کیا
ہم نے جاں نثار کی ہم نے گھر لٹا دیے
جان و مال چیز کیا اور ہے کرنا بھی کیا
عامرؔ ہمیں خوشی ہے یہ قول تو نبھا دیے

***